مقالاتِ بجنوری



ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری

مرحوم بجنوری پر کچھ لکھتے ہوئے دل دُکھتا ہے اور جب کبھی اُس عزیز کا خیال آتا ہے تو دل پر عجیب کیفیت گزرتی ہے جو بیان میں نہیں آسکتی۔ یہ ہماری قوم کے ان چند نوجوانوں میں تھے جنھوں نے یورپ کی تعلیم سے صحیح معنوں میں استفادہ کیا تھا ورنہ اکثر یہ ہوا کہ ظاہری نمود و نمائش بے معنی اور مہمل رسمیں مذموم آداب خوشی خوشی سیکھ کر آگئے اور اسی کو سرمایۂ علم سمجھ بیٹھے۔ مرحوم یورپ میں رہے مگر مشرقی اخلاق اور تہذیب کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مغرب سے وہ باتیں سیکھیں جو یہاں میّسر نہ تھیں۔ علم و ادب سے لگاؤ انہیں پہلے سے تھا۔ تحقیق اور تلاش و جستجو کی لگن نے اِس ذوق کو بہت پختہ کر دیا تھا۔ طبیعت بہت حساس اور نظر بہت وسیع تھی۔ دنیا کے ادبی شاہکار بہت کم ایسے ہوں گے جو اُن کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے اِس سے ان کے ذوق میں عجیب لطافت اور وسعت پیدا ہو گئی تھی جو اُن کے مضامین سے صاف ظاہر ہے۔

مولوی عبدالحق

مقالاتِ بجنوری

نوشتہ

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم

تدوین وتہذیب

اشرف رشید صدیقی

خلیق احمد صدیقی

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ٹرسٹ۔ اسلام آباد

پبلشر

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ٹرسٹ

بارِاول مئی ۲۰۰۴ء

تعداد ۱۰۰۰

کتابت زیرِ اہتمام ''ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ٹرسٹ'' اسلام آباد

طباعت۔ فیض الاسلام پرنٹنگ پریس۔ راولپنڈی

فہرست

☆☆☆☆☆☆☆

سخن ہائے گفتنی

زیر نظر کتاب ''مقالات بجنوری'' ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ٹرسٹ کی دوسری کاوش ہے۔ تقریباً دو سال پہلے ٹرسٹ نے ''محاسن کلام غالب'' کو فروگذاشت ہائے کتابت وطباعت سے محفوظ کر کے شائع کرنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد ہی سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ڈاکٹر بجنوری کی جو بھی تحریریں بشمول مکاتیب مل سکیں ان کو یکجا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اکثر و بیشتر وہ مضامین، مکاتیب اور اشعار ہاتھ آئے جو پہلے ہی ''باقیات بجنوری'' اور ''یادگار بجنوری'' میں شائع ہو چکے تھے۔ ان دونوں کتابوں کی طباعت کا انتظام ڈاکٹر بجنوری کے صاحبزادے محمد فاتح فرخ نے انتہائی نامساعد حالات میں کیا۔ گویا ایک قرض تھا جو ادا کرنا لازم تھا۔ شاید انہیں احساس تھا کہ وقت کا دامن ان کے لئے بھی زیادہ کشادہ نہ ہو اور یہ گمان کچھ غلط نہ تھا۔ یادگار بجنوری ۱۹۵۱ء میں انکی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے سول اینڈ ملٹری پریس کراچی سے شائع ہوئی۔ باقیات بجنوری مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر پہلے ہی آ چکی تھی۔ دونوں کتابیں اُس دورِ ابتلا کی نذر ہوگئیں جو ہر صدی بعد ساکنانِ ہند کو تاخت وتاراج کرتا ہے۔ پہلی اشاعت کے بعد دوسری

اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر و بیشتر اہلِ علم ان کے وجود سے بھی آگاہ نہیں۔ مزید یہ کہ ''محاسن کلامِ غالبؔ'' کی طرح یہ دونوں کتابیں بھی کتابت کی غلطیوں سے پُر ہیں۔ خاص طور پر جہاں مصنف نے مغربی مفکروں، فلسفیوں وغیرہ کا حوالہ دیا ہے املا کی غلطیاں قابلِ نظر انداز نہیں۔ بیشتر مقامات پر ان ناموں کو انگریزی زبان میں نہیں لکھا گیا اور جہاں لکھا گیا وہ اکثر درست نہیں۔ اندریں صورت دونوں کتابوں کی بارِ دگر طباعت بالصحت مناسب معلوم ہوئی۔ کسی نے رائے دی کہ دونوں کو مدغم کر دیا جائے۔ خوگرتن آسانی کیلئے یہ بات تمۂ رغبت سے کم نہ تھی مگر ایک خیال ضرور دامن گیر ہوا۔ کتاب کی ضخامت کا معمول سے تجاوز کرنا یقینی تھا۔ اس کا حل یہ نکلا کہ کچھ مضامین کو صرفِ نظر اور دو قدرے طویل مضامین ''اردو زبان کی ترقی کے متعلق چند خیالات'' اور ''وضع اصطلاحات علمیہ'' جن کا نفسِ مضمون ملتا جلتا ہے، کو مدغم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر بجنوری کا ایک انگریزی مضمون ''مثنویاتِ اقبال'' جس کا اردو ترجمہ مالک رام صاحب نے بطریقِ احسن کیا ہے اس میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک نظم جو پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی اس انتخاب میں شامل ہے۔

میں نے ان کتابوں کا سرسری مطالعہ کم از کم ربع صدی پہلے کیا تھا

اور اب ان کے مضامین نقش ونگار طاقِ نسیاں ہو چکے تھے۔ کسی کتاب کی اشاعت سے پہلے یہ دیکھنا ازبس ضروری ہے کہ اس کی ضرورت اور افادیت کیا ہے؟ اس میں دلچسپی کا کون سا پہلو ہے؟

دوبارہ مطالعہ بہ نظر غائر کیا تو احساس ہوا کہ تخلیقی ادب کبھی پژمردہ نہیں ہوتا اور اس کی شگفتگی صدیوں تک قائم رہتی ہے۔ اگر چہ یہ جواز ہی کافی تھا مگر جس بات نے مجھے مجبور کیا کہ اس مرقعہ ادب کو بالضرور پیش کیا جائے وہ یہ تھی کہ ڈاکٹر بجنوری کی تحریریں امت مسلمہ کیلئے بالعموم اور مسلمانانِ پاکستان کیلئے بالخصوص فکر انگیز ہیں۔ ان کا علمی تبحر، عقلی دلائل اور درد و سوز سے پُر مضامین ہمیں اپنے محاسبہ پر مجبور کرتے ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی کو قدرت نے ستر برس (۷۰) کی مہلت عطا کی، علامہ اقبال کو انسٹھ (۵۹) اور ڈاکٹر بجنوری کو فقط اکتیس برس (۳۱)۔ حالؔی اور خصوصاً اقبالؔ کی شاعری بہت بلند پایہ ہے مگر جو بات انہیں دوسرے شاعروں سے ممیز کرتی ہے وہ ان کا سوزِ دروں اور امت مسلمہ کی بیداری کے لئے جہد مسلسل ہے۔ دونوں مسلمانانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر بجنوری نے حالؔی کی شاعری کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا تھا جو اس کتاب میں شامل ہے۔ انہوں نے مثنویاتِ اقبالؔ

(اسرارورموز) پر ایک فاضلانہ مضمون انگریزی زبان میں تحریر کر کے غالباً پہلی بار مغرب میں اقبالؔ کو متعارف کرانے کا اعزاز حاصل کیا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، شیخ محمد نعیم صاحب کو اپنے خط مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۹۰ء میں تحریر فرماتے ہیں ''جی ہاں' میں بجنوری صاحب مرحوم کی شخصیت سے بخوبی واقف ہوں۔ انہی کی تحریک سے حضرت علامہ اقبالؔ نے رموز بےخودی تحریر کی تھی۔ یعنی وہ علاّمہ اقبالؔ کی نگاہ میں یہ بات لائے تھے کہ اسرارِ خودی میں فرد کا ذکر تو ہو گیا لیکن اسلامی معاشرہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔'' ڈاکٹر بجنوری کے جتنے مکاتیب میرے پاس ہیں ان میں شیخ محمد اقبالؔ کے نام کوئی خط نہیں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ان میں خط و کتابت بالکل نہ ہوئی ہو۔ یہ بھی یقینی امر ہے کہ دونوں میں کبھی نہ کبھی ملاقات ہوئی ہوگی کیونکہ دونوں نے لندن سے بیرسٹری اور جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ دونوں کے مقالات کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ اقبالؔ نے **Developement of Metaphysics in Persia** انگریزی اور بجنوری نے **Sources of Islamic Jurisprudence** جرمن زبان میں لکھے۔ مسلسل جدوجہد کے بعد ڈاکٹر بجنوری کا جرمن زبان میں مقالہ حاصل کرنے میں ہمیں کامیابی ہوئی ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اس کا اوّل انگریزی میں اور پھر اردو میں ترجمہ

کرایا جائے۔

اہل علم ایک دوسرے کو ذاتی تعلق سے کم اور افکار و کلام کی بلندی جدت، حسن اور پاکیزگی کے ذریعہ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ڈاکٹر بجنوری کے ایک دوست جو خود ادبی حلقوں میں مقام رکھتے تھے اپنے خط میں اقبالؔ کی شاعری کو بلند پایہ ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ اقبالؔ کی شاعری کا ابتدائی دور تھا اور ابھی تک انہیں علاّمہ اور شاعرِ مشرق وغیرہ جیسے خطابات سے نہیں نوازا گیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر بجنوری ان کے جوہرِ شاعری سے اس وقت بھی آشنا تھے۔ چنانچہ جواباً اپنے دوست کو لکھتے ہیں۔ ''آپ کی تنظیر سے مجھے اتفاق ہے۔ البتہ یہ خیال آپ کا درست نہیں کہ میں نے خواہ مخواہ حسنِ ظن کو کام میں لاکر اقبالؔ کے ہاتھ میں جامِ شیراز اور جامِ دہلی دے دیا ہے۔ وہ شراب جو اقبالؔ کی مینا میں ہے ''پنج آب'' نہیں بلکہ آبِ حیات ہے۔''

اسی طرح علاّمہ بھی ڈاکٹر بجنوری کی پوشیدہ قوتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اپنے تعزیتی خط میں جو انہوں نے شعیب قریشی صاحب کو ۸ نومبر ۱۹۱۸ء لاہور سے تحریر کیا تھا فرماتے ہیں۔ ''کل شام آپ کے تار نے خرمنِ صبر و قرار پر بجلی گرادی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ افسوس کہ گذشتہ

پچاس ساٹھ سال کی تعلیمی کشمکش کے بعد ایک آدمی ہم میں پیدا ہوا تھا جو دل و دماغ و سیرت کے اعتبار سے قدیم حکماء اسلام کا نمونہ تھا مگر مشیت ایزدی نے اسے ہم سے عین اس وقت جدا کر لیا جب کہ اس کی سخت ضرورت تھی۔ شاید مرحوم اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوا تھا یا جس سوسائٹی میں اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تھا وہ اس کی قدر نہ پہچان سکتی تھی! ہندوستان کی اسلامی دنیا میں بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جن کو بجنوری کی پوشیدہ قوتوں کا احساس ہوگا اور کیا عجب کہ مرحوم کو خود بھی ان قوتوں کا احساس نہ ہو لیکن اگر وہ دس سال ہم میں اور رہتا تو آنکھیں اس کے کمالات کی آب و تاب سے خیرہ ہو جاتیں۔''

اس کتاب میں جتنے مضامین اور نظمیں درج ہیں ماسوائے چند سب ڈاکٹر بجنوری کے تعلیمی زمانہ یعنی میٹرک سے بی اے تک کی فصل ہے اور انہیں زینت قرطاس ہوئے کم و بیش ایک صدی گزر گئی لیکن پڑھنے والا انہیں اب بھی مفید اور تر و تازہ پاتا ہے۔ مکاتیب زیادہ تر زمانہ قیام یورپ کے ہیں اور ان میں خصوصیت سے وہ خطوط جن میں بیسویں صدی کے آغاز پر ترکوں کی سیاسیات، اقتصادیات اور تمدنی کیفیت کا تفصیلی جائزہ درج ہے، انتہائی فکر انگیز ہیں۔ ایک عام سیاح تاریخی اور تفریحی مقامات سے زیادہ کچھ نہیں دیکھتا لیکن ڈاکٹر بجنوری کی دُور رس نگاہ ترکوں کے شاندار ماضی کے

ساتھ موجودہ کیفیت کا مفکرانہ جائزہ لیتی ہے۔ وہ ترکوں کے بڑے مداح تھے لیکن تعریف کے ساتھ ساتھ انہوں نے ترکوں کی زبوں حالی اور مغربی قوتوں کی یلغار سے متعلق جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے، فلسفہ عروج و زوال کی سچی داستان ہے۔ جو علل ایک صدی پہلے ترکی کی شکست و ریخت کے ذمہ دار تھے بہت حد تک ہمارے موجودہ حالات پر منطبق نظر آتے ہیں۔ اگر ترکی میں شخصی حکومت تھی اور امراء عہدوں کی خاطر بیرونی دشمنوں سے سازباز کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے تو کم از کم عوام اخلاقی پستی کا شکار نہیں تھے۔ اسی وجہ سے اگرچہ مفتوحہ علاقے ان کے قبضہ سے نکل گئے تاہم ترک اپنی آزادی برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ اس کے برعکس ہمارے معاملہ میں کوئی تخفیف اور رعایت کی صورت نظر نہیں آتی۔

ہمارے ارباب اختیار اور امراء اگر اخلاقی پستی کا شکار ہیں تو عوام الناس بوجہ جہالت اور فلاکت بہائم کی سطح سے کچھ زیادہ بلند نہیں۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

ڈاکٹر بجنوری ایک خط میں لکھتے ہیں ''جب مسلمانوں نے اندلس کو فتح کیا تو بادشاہ نے اپنے ندماء سے دریافت کیا کہ ہمارے پاس لشکر کثیر ہے

اور ہر طرح کے سامانِ مدافعت موجود ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ مسیحی لشکر مغلوب ہوتا جاتا ہے؟ کسی کو کوئی جواب بن نہ آیا۔ اس وقت ایک پیر مرد راہب نے کہا کہ جہاں پناہ مسلمانوں کے اخلاق ہم سے اچھے ہیں'' آج اہل مغرب کے اخلاق ہم سے بہتر ہیں اور وہ ہم پر غالب ہیں۔

آزادی کے پچیس سال کے اندر اندر ملک دولخت ہو گیا لیکن آج تک باز پرس نہیں کی گئی۔ آزادی کے وقت اگر معاشی، اقتصادی، تعلیمی اور تجارتی میدان میں ہم ترقی یافتہ دنیا سے پچاس برس پیچھے تھے تو آج نصف صدی گزرنے کے بعد سو سال کے بُعد پر ہیں۔ رہا اخلاقی انحطاط تو اس کی کوئی حد نظر نہیں آتی۔ مولانا حالؔی اور علاّمہ اقبالؔ اپنے دور کے مسلمانوں خصوصاً اہل وطن کی زبوں حالی اور پست ہمتی پر ماتم کناں تھے۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو شاید مایوسی ان کی زبان پر تالے لگا دیتی اور وہ کچھ نہ لکھتے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا آج اسے کوئی نہ پڑھتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ ہاں یومِ اقبالؔ پر تعطیل منالی جاتی ہے اور چند مجالس میں خراجِ عقیدت پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا مذاق ہو گا کہ جو شخص تگاپوئے دمادم کو زندگی کی دلیل سمجھتا ہو اس کے یومِ ولادت کو قوم یومِ استراحت سے زیادہ وقعت نہ دے۔ سرسیّد ہی نے تو کہا تھا کہ جب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ دنیا سے کیا

لے کر آئے ہو تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدّس لکھوالایا ہوں۔ مسدّس سے کچھ اقتباس درج کرتا ہوں دیکھئے کل اور آج میں کوئی فرق محسوس ہوتا ہے؟ ہاں فرق ضرور محسوس ہوگا اور وہ یہ کہ جن کا ذکر اُس میں ہے وہ بہر صورت ہم سے بہتر تھے۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

کسی قوم کا جب اُلٹتا ہے دفتر تو ہوتے ہیں مسخ اُن میں پہلے تونگر
کمال اُن میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر نہ عقل اُن کی ہادی نہ دین اُن کا رہبر
نہ دنیا میں ذلّت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا
نہ مظلوم کی آہ وزاری سے ڈرنا نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا تعیش میں جینا نمائش پہ مرنا
سدا خوابِ غفلت میں بیہوش رہنا
دمِ نزع تک خود فراموش رہنا

خوشامد میں ہم کو وہ قدرت ہے حاصل کہ انساں کو ہر طرح کرتے ہیں مائل

کہیں احمقوں کو بناتے ہیں عاقل کہیں ہوشیاروں کو کرتے ہیں غافل
کسی کو اُتارا کسی کو چڑھایا
یونہیں سینکڑوں کو اسامی بنایا

یہ ہیں ترکِ تعلیم کی سب سزائیں
وہ کاش اب بھی غفلت سے باز اپنی آئیں
مبادا رہِ عافیت پھر نہ پائیں
کہ ہیں بے پناہ آنے والی بلائیں
ہوا بڑھتی جاتی سرِ رہگذر ہے
چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے

علاّمہ کی مشہور نظم جوابِ شکوہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔
جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن، تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟
کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہوگئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطابیں، وہ خطاپوش وکریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی ان کا تھا، سریرِ کے بھی
یوں ہی باتیں ہیں، کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی
خودکشی شیوہ تمھارا، وہ غیور و خوددار
تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی

ہمارے اربابِ حل وعقد کی بے بصیرتی اور کج فہمی کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ ان کے نزدیک مسائل کا حل نئے قوانین، نئی وزارتیں، نئے محکمے اور نئے ادارے قائم کردینے میں یا پھر بجٹ بڑھا دینے میں ہے۔ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے نوآبادیاتی نظام کو موردِ الزام ٹھہراتے

ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ خرابی قوانین اور انتظامی ڈھانچے میں نہیں بلکہ قوانین نافذ کرنے والوں میں ہے جو کم عقلی کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ ملک مشیت ایزدی سے نہیں بلکہ ان کی تدبیر سے چل رہا ہے۔ مختصر یہ کہ اخلاقی پستی ہی اصل مسئلہ ہے اور اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ جہاں قوانینِ فطرت سے بغاوت کی جائے وہاں ترقی کیوں کر ہوگی۔ ساری کائنات اور ہر ترقی یافتہ قوم بقائے اصلح (Survival of the fittest) کے اصول پر کاربند ہے۔ ہم اس کے برعکس بقائے اسفل (Survival of the inferior) پر عمل پیراہیں۔ مستثنیات کا ذکر اس لئے ضروری نہیں کہ اس کے بغیر کوئی قاعدہ کلیہ ممکن نہیں۔

بیرسٹری کا امتحان پاس کر لینے پر ڈاکٹر بجنوری کو ان کے قریبی دوست ڈاکٹر سید محمود (سرسید کے صاحبزادے) کی طرف سے پیش کش ہوئی کہ وہ ان کے ساتھ مل کر وکالت کریں۔ جواب میں اپنے ۱۰ ِ جنوری ۱۹۱۳ء کے خط میں وہ سید محمود کو تحریر کرتے ہیں " ــــــ کالج (ایم۔ اے۔ او کالج) میں پروفیسری حاصل کرنے کی میری خواہش اس وجہ سے تھی کہ مجھے لکھنے پڑھنے کے لئے سکون اور فرصت مل سکے۔ میں زندگی کا سامنا کرنے سے نہیں ڈرتا، لیکن میں دنیا سے اپنے قلم کی مدد سے لڑنا چاہتا

ہوں۔۔۔۔۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اگر میں وکالت کروں گا تو میرے اندر کی بعض ایسی صلاحیتیں جن میں کچھ دم ہے' جلد ہی فنا ہو جائیں گی اور عبدالرحمٰن نہ بچے گا۔۔۔۔۔ آپ نے جو پیشکش کی ہے اُس پر پھر سے آتے ہوئے میں پھر آپ کے لئے اپنی شکر گزاری کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تھوڑا بہت اُن ''نوجوان بیرسٹروں'' کے بارے میں معلوم ہے جن کی پیشکش کو آپ نے ٹھکرا دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اُن میں سے ایک لائق باپ کے لائق فرزند ہیں اور اُن کا آپ کے ساتھ کام کرنا آپ کے لئے بھی کچھ کم فائدہ مند نہیں ہوتا۔ ایک اور کے ساتھ ان کے حق میں بڑی اچھی سفارش تھی۔ تیسرے مراسم کے لحاظ سے آپ کے بہت قریب تھے۔ جب میں یہ سب سوچتا ہوں تو میری آپ کے ساتھ وابستگی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ مزید میرا آپ کے ساتھ آجانے کا مطلب یہ ہوتا کہ آپ کے گھر میں ایک کا نہیں چار لوگوں کا اضافہ ہو جاتا۔ میری اہلیہ اور بچوں کو ملا کر۔۔۔ ''

ڈاکٹر بجنوری کے افکار میں روشن خیالی اور عقلیت پسندی کا عنصر غالب ہے۔ ہر چند کہ گفتار، لباس اور وضع قطع میں وہ مشرقی روایات کے پابند تھے مگر کورانہ تقلید کے سخت مخالف تھے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں '' سچے مذہب کو کبھی بلند نظری اور رواداری سے نقصان نہیں پہنچتا بلکہ کور بینی اور تنگ

خیالی ہی اس کی اصل دشمن ہے''۔ ڈاکٹر بجنوری تعلیم نسواں اور آزادیٔ نسواں کے زبردست حامی تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی کو جو کچھ مختلف رائے رکھتے تھے لکھتے ہیں۔'' آپ کے جملہ دلائل کا سہ آتشہ عطر یہ ہے کہ مذہب کے خلاف ہے، غلط۔ تاریخ سے ثابت ہے، غلط۔ شیرازہ ریزی کا خوف ہے، اس دلیل کی بنیاد حسد پر ہے۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

پردے میں تعلیم! اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا سینا پرونا؟ شیخ عبداللہ اور مولوی سعید احمد دہلوی کے مجوزہ نصاب دیکھ لینا تعلیم ہے؟

تعلیم وہ شے ہے جو ہنوز یورپ میں بھی عورتوں کو پوری آزادی سے حاصل نہیں البتہ ہونے والی ہے، یعنی سیاست، تمدن، صلح، جنگ، ہر بات میں ان کو حسب لیاقت مردوں کی مساوات اور اُن سے فوق لے جانے کی اجازت ہو، قانون دونوں کے لئے ایک ہو۔ پس اُس خوف کو بالائے طاق رکھئے۔ خدا جو مردوں کو معاف کرتا ہے عورتوں کو بھی معاف کرنے والا ہے۔ اُس کی نظر میں دونوں ایک ہیں۔''

اگرچہ ڈاکٹر بجنوری کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا مگر وہ سمجھتے تھے کہ

مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ایک جگہ لکھتے ہیں" جو قوم یوں اپنی زبان سے غافل ہو وہ دنیا میں کیا فروغ پا سکتی ہے؟ جس ملک کے لوگ اپنی مادری زبان کو پسِ پشت ڈال دیں اس کی خاک سے بھلا کب کوئی فرزانہ اُٹھ سکتا ہے؟ جو ملّت اپنی زبان کو باعثِ ننگ اور دوسروں کی زبان کو مایۂ ناز خیال کرے اس میں کیا خودداری آسکتی ہے؟ یہ اپنی زبان میں تعلیم نہ پانے کا اثر ہے کہ ۱۸۵۷ء سے آج تک مغربی تعلیم پانے کے باوجود کوئی قومی اور ملکی نتیجہ نہیں نکلا۔ جاپانیوں نے صرف ستر سال کی جدید تعلیم سے یورپ کی ہم نشینی کی قابلیت حاصل کر لی ہے۔مغرب میں عورتوں کی تعلیم کو صرف چالیس برس ہوئے ہیں۔جو لوگ کہ اب اظہارِ خیالات کے لئے غیر زبان کے محتاج ہیں اور جو آئندہ یہی روش قائم رہی تو اور زیادہ دستِ نگر ہوں گے۔وہ بھلا کیا قوم و ملّت کی بنیاد ڈال سکتے ہیں؟ ان کی زندگی ایک تقلیدِ غلامانہ اور ایک انجذ اب گدایانہ ہونی ضروری ہے۔"

اس بات کو تحریر کئے نوے برس گذر گئے۔موجودہ دور میں چین کی مثال موجود ہے جس نے ترقی کی منازل اپنی زبان کے ذریعہ طے کیں۔ایک خط میں اپنے چھوٹے بھائی حبیب الرحمٰن کو لکھتے ہیں" دوسری بات یہ ہے کہ کوئی انسان جب تک کہ اپنی قومی اور ملکی زبان کا ماہر نہ ہو باوجود ہمہ علم و قابلیت "

چار پائے بر و کتابے چند' کا کم و بیش مصداق ہے۔ ہم ہندوستانیوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم میں سے کوئی انگریزی زبان میں ملٹن یا شیکسپیئر کا پایہ حاصل کر سکے مگر ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم غالبؔ اور اقبالؔ کے درجہ کو پا جائیں۔ اور ہماری تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ہم اردو سے ناواقف رہے ہیں''۔

ترقی کے لئے صرف اپنی زبان کا اپنانا ہی کافی نہیں کیونکہ کئی اقوام اس معیار پر پورا اترنے کے باوجود بھی پسماندہ ہیں۔ لیکن اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اگر باقی تمام شرائط اور مادی اسباب پورے ہوں تب بھی کوئی قوم خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتی تا آنکہ قومی زبان میں تعلیم رائج کرے۔ آج ہم اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔ قدرتی وسائل ہیں، افرادی قوت ہے، صنعت و حرفت ہے، تعلیمی ادارے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ چین سے دو سال پہلے آزادی حاصل کرنے کے باوجود ہم اُس سے کم از کم پچاس برس پیچھے ہیں۔ جاپان نے ترقی کر لی، روس نے ترقی کر لی، اسرائیل نے ترقی کر لی، چین نے ترقی کر لی، کوریا نے ترقی کر لی، ملیشیا نے ترقی کر لی، مگر ہم نے ترقی نہیں کی، ہندوستان نے ترقی نہیں کی، بنگلہ دیش نے ترقی نہیں کی، سری لنکا نے ترقی نہیں کی اور فلپائن نے ترقی نہیں کی۔ ان پانچوں ممالک میں

قدر مشترک یہ ہے کہ ان کی سرکاری یا مقتدر زبان انگریزی ہے۔ ہم انگریز اور اس کی زبان سے اس قدر مرعوب ہیں کہ اپنے اسلاف اور اکابرین کے کارناموں پر شرمسار ہوتے ہیں۔ پروفیسر خورشید الاسلام نے ڈاکٹر بجنوری پر اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے ''زمانہ سخت ذہنی کشمکش کا تھا۔ سرسید کی تحریک نے جہاں لوگوں کی آنکھیں کھولی تھیں وہاں ان کو خیرہ کرنے کا سامان بھی مہیا کر دیا تھا، انگریزی تعلیم نے اپنی روایات سے حجاب اور اپنے حال پر خندہ یا گریہ سکھانے کے ساتھ ساتھ مغرب سے ایسی مرعوبیت پیدا کر دی تھی کہ کالیداس کا نام کیٹس (John Keats 1795-1821) کے سامنے اور غالب کا نام براوننگ (Robert Browning 1812-89) کے سامنے لینا گستاخی اور جہل سے بڑھ کر کفر کے درجہ میں آ گیا تھا''۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، سیوہارہ، ضلع بجنور، ۱۰ جولائی ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے اور اکتیس سال کی عمر میں انفلوئنزا کے وبائی مرض میں مبتلا ہو کر ۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو بھوپال میں انتقال کر گئے۔ انکی اہلیہ بھی اس بیماری اور صدمہ سے جاں بر نہ ہو سکیں اور تین روز بعد دنیا سے کوچ کر گئیں۔ ڈاکٹر بجنوری کا خاندان علم و فضل میں ممتاز مقام رکھتا تھا۔ منصبِ قضا برسہا برس تک ان کے آباواجداد کو وراثت میں ملتا رہا۔ ڈاکٹر بجنوری کے والد خان

بہادر نورالاسلام ایک طویل عرصہ تک قندھار میں سفیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ وہ فارسی پر اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹر بجنوری کی اولاد میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ والدین کی آغوش اور شفقت سے محروم ہونے کے بعد ان کی پرورش ان کے دادا اور دادی نے کی۔ اپنی بڑی پوتی طاہرہ خاتون کی شادی کا فرض خان بہادر صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ادا کر دیا تھا۔ اس موقعہ پر جو دعوت نامہ انہوں نے اعزّہ و اقرباء کو بھجوایا وہ ان کی شاعری کے نمونے کے طور پر کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ طاہرہ خاتون کا انتقال ۲۳ سال اور فاتح فرخ کا ۳۶ سال کی عمر میں ہوا۔ ڈاکٹر بجنوری کی اولاد میں صرف میری والدہ سردار خاتون عمر طبعی کو پہنچیں اور بعمر ۸۰ سال کراچی میں انتقال کیا۔

ڈاکٹر بجنوری کا شجرہ نسب محمد بن ابوبکر صدیق ؓ خلیفہ اوّل سے پینتیسویں (۳۵) پشت میں جا کر ملتا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ قاضی حسن نور اللہ مرقدہ ایک بڑے عالم دین اور مرد کامل تھے۔ وہ عرب سے ہجرت کر کے ایران کے شہر زنجان میں آباد ہو گئے۔ انہیں کئی ہزار احادیث زبانی یاد تھیں۔ بابر بادشاہ جب سریر آرائے سلطنت ہوا آپ کا شہرۂ فضل و کمال سُن کر فرغانہ طلب کیا اور مشیر خاص بنالیا۔ شہنشاہ بابر کے ہمراہ

ہند آئے۔ ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد ان کو دیگر روساء کے زیر کرنے پر معمور کیا۔ بہت سا علاقہ انہوں نے فتح کیا اور جاگیر میں ملا اور منصبِ پنج ہزاری عطا ہوا۔ اکبر اعظم نے ان کو لاہور کا قاضی بنا کر بھیجا۔ ۹۷۵ھ بعمر ۱۰۰ سال وفات پائی اور مزنگ کے دیرینہ قبرستان میں شاہ سریائیؒ کے مزار کے پاس ان کا مزار تھا۔ اب تمام آثار لاپتہ ہیں۔ قاضی محمد تحسین صدیقی بیدلؔ نے خاندان کے مورث اعلیٰ قاضی حسن زنجانی کو خراجِ عقیدت ان اشعار میں پیش کیا ہے:

بابر جنت مکاں کے ساتھ تھے قاضی حسنؒ
جنگ پانی پت ہوئی جب شاہِ ہندوستان سے
ہوگیا سلطان ابراہیم میداں میں شہید
شاہِ غازی تخت پر بیٹھا نہایت شان سے
سونپ دی مسندِ قضا کی اس بزرگِ دین کو
لائی تھی گویا قضا لاہور میں ایران سے
شیخ سریانی کے پہلو میں تھی اِن کی گورِ پاک
ہو چکے سارے نشاں معدوم گورستان سے

مرحبا قدموں میں اِن کے مجھ کو لایا انقلاب

حق کرے ہو خاتمہ بالخیر اب ایمان سے

جدِّ امجد کو مرے اللہ دے خلدِ بریں

مغفرت کی التجا ہے صاحبِ غفران سے

بیدلؔ عاصی خدا کی مصلحت میں کیا مجال

ہند آئے مورثِ اعلیٰ مرے زنجان سے

منصبِ قضا مغلیہ حکومت کے خاتمے تک ان کے خاندان میں رہا۔ جاگیریں بھی بہت عرصہ تک قائم رہیں۔ اکثر دستاویزات اور فرامین ضائع ہو گئے ایک دو جو بچے رہ گئے کرم خوردہ ہیں۔ فرخ سیر بادشاہ جو ۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء سریر آرائے سلطنت رہا اور بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار ہند کے فرامین کی مہریں اب بھی صاف پڑھی جاتی ہیں۔ اس کتاب کا غلاف ان فرامین کی اسکینگ سے تیار کیا گیا ہے۔ مغلوں کی حکومت کے زوال کے بعد اگرچہ اس خاندان کی پہلی سی حیثیت تو باقی نہ رہی لیکن علم و فضل کی میراث موجود تھی جس کی بنا پر انگریزوں نے بھی قدر دانی کی۔ نورالاسلام صاحب کا ذکر آچکا کہ وہ افغانستان میں انگریزوں کے سفیر رہے۔ ان کے دادا مولوی محمد یاسین غریقؔ امرتسر کے ڈپٹی کلکٹر تھے اور ترن تارن میں مدفون

ہیں۔ ڈاکٹر بجنوری کے بہنوئی کرم الٰہی قریشی صاحب میانوالی میں سینئر سب جج کے عہدے پر فائز تھے۔ اس طرح ڈاکٹر بجنوری کے داماد شجاعت علی صدیقی صاحب (میرے والد) ۱۹۲۸ء میں مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہوکر اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔

میں نے ڈاکٹر بجنوری کی زندگی کے متعلق کچھ معلومات پیش کرنے کی کوشش کی ہے جہاں تک ان کے مضامین کا تعلق ہے مجھ میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس پر خامہ فرسائی کروں۔ باقیات بجنوری کا تعارف جناب رشید احمد صدیقی نے تحریر کیا تھا جبکہ یادگار بجنوری کا تعارف مولانا عبدالحق صاحب نے لکھا تھا۔ ان دونوں کو کتاب میں شامل کر دینے کے بعد مزید کسی تعارف کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آخر میں چند الفاظ سپاس گذاری کے۔ میں ان تمام لوگوں کا تہہِ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً دستاویزات، مکاتیب، مضامین، تصاویر اور کلام فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ میری رہنمائی کی۔ میں خصوصیت سے اپنی ممانی رضیہ فاتح فرخ کا شکر گذار ہوں جنہوں نے دیگر چیزوں کے علاوہ ڈاکٹر بجنوری کا جرمن زبان میں مقالہ (جس پر انہیں فرائی برگ یونیورسٹی۔ جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی) عطا کیا۔ شفیق الاسلام صاحب کا (ڈاکٹر

بجنوری کے چچازاد بھائی) شجرہ نسب اور دیگر تحریریں فراہم کرنے پر، شیخ محمد نعیم کا جنھوں نے ٹرسٹ کو دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ ۱۹۲۱ء کے طباعت شدہ دو نادر نسخے ہدیہ کئے، بڑے بھائی نصرت رشید صدیقی کا جو دامے درمے سخنے ٹرسٹ کے معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں، پروفیسر خلیق احمد صدیقی کا جو بجنوری ٹرسٹ میں اعزازی مدیر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر طرح سے میرے مددگار ہیں، مس فرح دیبا کا جنھوں نے انتہائی عرق ریزی سے مسودہ کو ٹائپ کیا اور سرورق ترتیب دیا۔ سب کا فرداً فرداً ذکر ممکن نہیں لیکن ناانصافی ہوگی اگر میں اظہار ممنونیت میں اپنی اہلیہ کشور سلطانہ کا ذکر نہ کروں ۔ نہ صرف اس لئے کہ ہر ہر قدم پر وہ میرے ساتھ ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ڈاکٹر بجنوری ٹرسٹ قائم کرنے کا خیال سب سے پہلے اسی کو آیا تھا اور اسکی مسلسل اعانت کے بغیر یہ خیال محض خیال ہی رہتا۔

عیب طول کلام مت کریو
کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا

اشرف رشید صدیقی

☆☆☆☆☆☆☆

تعارف

(از جناب مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب)

(نوٹ: یہ تعارف ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے "یادگار بجنوری" کے لئے لکھا تھا)۔

مرحوم بجنوری پر کچھ لکھتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ اور جب کبھی اس عزیز کا خیال آتا ہے تو دل پر عجیب حالت گزرتی ہے جو بیان میں نہیں آسکتی یہ ہماری قوم کے ان چند نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے یورپ کی تعلیم سے صحیح معنوں میں استفادہ کیا تھا۔ ورنہ اکثر یہ ہوا کہ ظاہری نمود و نمائش، بے معنی اور مہمل رسمیں، مذموم آداب خوشی خوشی سیکھ کر آگئے اور اسی کو سرمایہ علم سمجھ بیٹھے۔ مرحوم یورپ میں رہے مگر مشرقی اخلاق اور تہذیب کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مغرب سے وہ باتیں سیکھیں جو یہاں میسر نہ تھیں۔ علم و ادب سے لگاؤ انہیں پہلے سے تھا۔ تحقیق اور تلاش و جستجو کی لگن نے اس ذوق کو بہت پختہ کر دیا تھا۔ طبیعت بہت حساس اور نظر بہت وسیع تھی۔ دنیا کے ادبی شاہکار بہت کم ایسے ہوں گے جو ان کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے۔ اس سے ان کے ذوق میں عجیب لطافت اور وسعت پیدا ہوگئی تھی جو ان کے مضامین سے صاف ظاہر ہے۔

تعلیم کے مسئلے سے انہیں خاص شغف تھا۔ ممالکِ یورپ کے تعلیمی طریقوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ یہاں آ کر انہوں نے ایک کالج قائم کرنے کا ڈول ڈالا تھا جس میں جدید طریقہ پر صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام ہو۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے اس کی تفصیل سن کر اس کی سرپرستی فرمائی اور معقول رقم جمع کر دی۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے بھی ایک رقم اس کے لئے عطا فرمائی۔ لیکن مرحوم کی بے وقت موت نے اس منصوبہ کو ان کے ساتھ ہی دفن کر دیا۔ شعیب قریشی صاحب اور عبدالرحمٰن صدیقی صاحب اس منصوبے میں ان کے ہم خیال اور ہم کار تھے اور ان تینوں نوجوانوں نے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویز جب زیرِ بحث تھی تو ان کے مشورے، بہت کارآمد ثابت ہوئے۔

جامعۂ عثمانیہ کے قائم کرنے کا ڈول بھی اسی وقت ڈالا جا رہا تھا۔ دارالترجمہ قائم ہو چکا تھا۔ مختلف فنون اور علوم پر کتابیں ترجمہ اور تالیف ہو رہی تھیں۔ دو برس کی مسلسل محنت کے بعد اتنا سرمایہ ہو گیا تھا کہ میٹرکولیشن اور انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں تمام مضامین اردو میں پڑھا سکیں۔ اب جامعہ کی ابتداء ہونے والی تھی، پرنسپل کی تلاش تھی۔ بہت غور و فکر اور گفتگو کے

بعد قرعہ ڈاکٹر بجنوری کے نام پڑا۔ عین اس وقت جب عرضداشت بغرضِ منظوری اعلیٰ حضرت حضور نظام کی پیشگاہ میں پیش ہونے والی تھی، اجل نے ہم سے اس جوہر قابل کو چھین لیا۔

مرحوم کبھی کبھی کسی حالت یا منظر سے متاثر ہو کر شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی نظم ''شوجی کا رقص'' بہت مقبول ہوئی۔ نظم کے ایک ایک لفظ سے نرت کی حرکت اور جنبش ہویدا ہے۔ اگر نظم پڑھتے ہوئے شوجی کے نرت کی تصویر بھی سامنے ہو تو عجیب سماں پیدا ہو جائے۔ لیکن شعر گوئی سے بڑھ کر ان میں شعر فہمی کا مادّہ تھا۔ غالبؔ پر ان کی تنقید اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے مرزا کے اشعار کی تشریح میں کیسے کیسے نکات پیدا کئے اور سربستہ راز آشکارا کئے ہیں۔

جب مرزا غالبؔ کے کلام کا قدیم نسخہ جو مرزا صاحب نے بھوپال کے فوجدار خاں کو نذر کیا تھا، مرحوم کی نظر پڑا تو مارے خوشی کے بیتاب ہو گئے اور اس اصل نسخے کی طباعت کے لئے بڑے بڑے سامان کئے۔ اعلیٰ درجے کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب، طباعت کے لئے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کی تشریح کے لئے چابک دست مصوروں سے تصویروں کی فرمائش۔ ان کا یہ انہماک دیکھ کر ان کے بعض دوست بھی اس شاہکار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے لیکن افسوس موت

نے اتنی مہلت نہ دی اور یہ سب ٹھاٹھ یوں ہی پڑے کا پڑا رہ گیا۔

وہ دیوان بعد میں "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا۔ جیسے اور کتابیں معمولی طور پر شائع ہوتی ہیں۔ جو بات ڈاکٹر بجنوری چاہتے تھے وہ کسی دوسرے کے بس کی نہ تھی۔

ڈاکٹر عبدالرحمن کی ذہانت، جودتِ طبع، وسیع نظری اور علم وفضل کو دیکھ کر دل میں عزت و احترام پیدا ہوتا تھا۔ لیکن جب ان کے اخلاق پر نظر ڈالئے اور ان کی شرافتِ نفس، عالی ظرفی، رواداری، انکسار، ادب اور مشفقت، دوستی اور محبت، حیا اور خودداری کو دیکھتے تھے تو دل بے اختیار ان کی طرف کھنچتا تھا اور ان سے محبت ہونے لگتی تھی۔ ان کے اخلاق کو دیکھ کر غیر بھی اپنے ہو جاتے تھے۔ ان کے مذہب میں دل آزاری کفر تھی۔ لیکن رائے کی آزادی میں وہ سب سے آگے تھے۔

ایسے جوہرِ قابل کا عین عالمِ شباب میں اٹھ جانا اس کے خاندان اور اس کے احباب ہی کے لئے ایک المناک حادثہ نہ تھا بلکہ درحقیقت ایک قومی سانحہ تھا۔ اس کا دل اور دماغ بہت لطیف اور نازک تھا۔ وہ ایک نازک پودا تھا جو سمومِ زمانہ کی تاب نہ لا سکا اور وقت سے پہلے اس دنیا سے منہ موڑ کر چلا گیا۔

تعارف

(از جناب رشید احمد صدیقی صاحب)

''باقیاتِ بجنوری'' عبدالرحمٰن مرحوم کے مضامین اور خطوط کا مجموعہ ہے۔ آخر میں کچھ مختصر نظمیں بھی شامل ہیں۔ بجنوری مرحوم علیگڑھ کے بڑے ہونہار اور قابل طلبا میں سے تھے اور اپنے معاصرین میں بڑا امتیاز درجہ رکھتے تھے۔ اردو داں طبقہ بالخصوص حلقۂ شعر و ادب میں سب سے پہلے وہ دیوانِ غالب (نسخۂ حمیدیہ) کا دیباچہ ''محاسنِ کلامِ غالبؔ'' لکھنے پر مشہور و مقبول ہوئے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب کو نفسیاتی اسلوبِ تنقید کی روشنی میں پہلے پہل بجنوری مرحوم ہی نے پیش کیا۔ ان سے پہلے غالبؔ پر طباطبائی اور حسرت کی شرحیں شائع ہو چکی تھیں لیکن ان کی حیثیت تنقیدی نہ تھی بلکہ تشریحی اور مکتبی تھی۔ یہ بجنوری مرحوم کے مقالے کا تصرف ہے کہ آجکل کے پڑھے لکھوں میں غالبؔ سے شیفتگی پیدا ہوئی اور اربابِ ذوق و فکر نے غالبؔ ہی نہیں بلکہ دوسرے شعراء کو بھی بجنوری مرحوم ہی کے اندازِ تنقید سے جانچنا پرکھنا شروع کیا۔

اردو شعر و ادب کو فرسودہ اور پیچ در پیچ راستوں سے نکال کر انگریزی

اسلوب نگارش سے آشنا کرانے اور مقبول بنانے میں سرسید اور انکے رفقاء بالخصوص حالی مرحوم کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن انگریزی ہی نہیں بلکہ یورپ کے دوسرے زندہ جاوید شعراء اور مفکرین کے خیالات کی روشنی میں غالب کو پیش کر کے بجنوری مرحوم نے اردو داں طبقے کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔ ان کے عہد تک جدید لکھنے والے اکثر یورپ کی بعض ادبیات کے لطائف و رعنائیوں کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ بجنوری مرحوم نے ان سے بہت آگے بڑھ کر اردو کو یورپ کی بعض مستند ادبیات کی گراں مائیگی سے روشناس کرایا۔ ان کے بعد اردو دانوں نے اسلوب نگارش ہی میں نہیں بلکہ فکر و مطالعہ کے لئے موضوعات انتخاب کرنے میں بھی زیادہ جرأت و ذمہ داری سے کام لینا شروع کیا۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی تنقید میں بجنوری مرحوم نے کہیں کہیں مبالغہ سے کام لیا ہے، جہاں تہاں اشعار کے صحیح مفہوم سے بھی دور جا پڑے ہیں۔ لیکن اس سے ان کے خلوص یا ان کی ذہنی جامعیت پر آنچ نہیں آتی۔ مجتہد یا امام کے لئے یہ مراحل ناگزیر ہیں۔ بجنوری مرحوم مفکر زیادہ اور آرٹسٹ کم تھے۔ ان کی نظموں کا آپ مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ وہ آرٹسٹ سے ابتدا کرتے تھے اور مفکر میں گم ہو جاتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مفکر کے بوجھ

کو آرٹسٹ کی دل آویزیوں سے ہلکا کرنا چاہتے تھے۔

مرحوم عظمت اللہ خاں بجنوری مرحوم ہی کی نظموں سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔عربی فارسی کے متداول بحور و عروض سے آزاد ہو کر اپنے خیالات کو کم، جذبات کو زیادہ مترنم بنانے میں دونوں کو لطف آتا تھا۔لیکن دونوں میں جو بات مابہ الامتیاز ہے وہ یہ کہ بجنوری روایتی ثقاہت وثقافت اور مفکرانہ گراں مائیگی سے کبھی علیٰحدہ نہیں ہوتے تھے،زیادہ سے زیادہ یہ کرتے تھے کہ کبھی کبھی رنگین الفاظ اور رقصاں ترکیبوں سے کھیل لیا کرتے تھے۔یہی بات اور یہی رنگ ذوقؔ کے ابتدائی قصیدوں میں ملتا ہے۔عظمت اللہ خاں جذبات کی نمائش یا مظاہرہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان سے ایک طرح کی لذت یابی کے درپے رہتے تھے۔عظمت اللہ خاں میں اس 'التذاذ' یا 'لذتیت' کا ردِعمل ''حزن وافسردگی'' ملے گی، بجنوری میں حسن اندیشی اور فکر کاری۔

اس طور پر دو جدید تحریکوں کا سرچشمہ بجنوری مرحوم ہی میں ملتا ہے۔

بجنوری مرحوم کی تحریریں الفاظ و عبارت کے اعتبار سے کچھ بہت زیادہ سلیس و سہل نہیں ہیں۔اکثر فقرے اور عبارتیں نامانوس معلوم ہوں گی۔کہیں کہیں پُرتکلف یا بوجھل۔لیکن یہ زمانہ وہ تھا جب جدید علوم وفنون کی مصطلحات عام نہ تھیں اور اسالیبِ انشا محدود تھے۔بجنوری مرحوم کو وہی

دقتیں پیش آئیں جو غالبؔ کو پیش آئی تھیں، یعنی معانی پر الفاظ کا جامہ تنگ تھا پھر یہ بھی ہے کہ مرحوم غالبؔ سے متاثر بھی کافی تھے۔ انکی تحریروں میں غالبؔ کے مخصوص اسالیب بہت نمایاں ہیں چنانچہ جب ہم انکی تحریروں کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ ان کو عالمانہ اور مجتہدانہ طرزِ نگارش کی بنیاد رکھنی تھی، تو ہم کو یہ باتیں عجیب نہیں بلکہ مستحسن معلوم ہونے لگتی ہیں۔

وہ مغربی طور طریقوں کے ساتھ ساتھ مشرقی رکھ رکھاؤ کے بھی بڑے حامل تھے۔ اپنے بزرگوں کو جو خطوط انہوں نے لکھے ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ حفظِ مراتب کے بڑے پابند تھے۔ والدین اور دوسرے چھوٹے بڑوں کو ان ہی آداب و القاب سے یاد کرتے ہیں جو اس زمانے میں رائج تھے لیکن ساقط الاعتبار ہو چکے تھے۔ بجنوری مرحوم نے انہیں جس لب و لہجہ اور جس جس موقع پر استعمال کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی معنوی اہمیت کے دل سے قائل تھے۔ آپ ان کے خطوط کا مطالعہ فرمائیں تو فی الفور محسوس کریں گے کہ وہی آداب و القاب یا متداول فقرے جو عام خطوط میں محض رسمی یا نمائشی معلوم ہوتے ہیں مرحوم کے قلم سے نکل کر کتنے قابلِ قدر اور دل آویز بن گئے ہیں۔ بزرگوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت اور ان سے انتہائی شغف ان کی تحریر کے ہر ہر لفظ سے ٹپکتا ہے۔

اپنے بھائی حبیب الرحمٰن کو وہ جس محبت سے یاد کرتے ہیں اور جس جس طرح سے زندگی کے اونچ نیچ، مطالعہ کے طریقے، کتابوں کا انتخاب، حفظانِ صحت کے اسلوب، پروفیسروں کا احترام، کالج کی زندگی کے مختلف مراحل، اپنے تجربات، ائمہ کے اقوال، مذہب و اخلاق کے مطالبات بتاتے ہیں، ان سے ان کی محبت، عالی ظرفی، وسعت نظر، بلندیِ فکر، استواری عقیدہ، اور سنجیدگی طبیعت کا بڑا دلنشیں نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

مسلمانانِ ہند ترک کے ہمیشہ سے محبوب رہے ہیں۔ بجنوری مرحوم کا زمانہ ترکوں کے لئے بڑے آشوب و آزمائش کا زمانہ تھا۔ وہ ترکوں کی ''شرافت، جرأت، دیانت اور تقویٰ'' کو بڑی سچائی اور درد کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ترکوں کی محبت اور اسلام کی زبوں حالی پر وہ بے اختیار ہوگئے ہیں۔ انہوں نے کہیں انفرادی یا شخصی مطالبۂ نفس کا اظہار نہیں کیا ہے۔ جو بات کہی ہے اس طور پر کہی ہے گویا انسان و انسانیت کا تقاضا یہی تھا۔ اپنے عہد کے حالات و حوادث بیان کرنے میں اکثر مؤرخ جوش یا مبالغہ سے کام لینے لگتے ہیں۔ بجنوری مرحوم سنجیدگی اور راستی کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیتے۔ وہ فروعات کو اصل پر کبھی ترجیح نہیں دیتے جو آج کل کے لکھنے والوں کا سب سے بڑا عیب یا فریب ہے، یعنی فروعات کو اس طرح پیش کرنا کہ اصل

آنکھوں سے اوجھل ہی نہ ہو جائے بلکہ خود اصل سے نفرت ہونے لگے۔

''گیتا نجلی'' پر جس انصاف و ارادت کے ساتھ عالمانہ نکتے اور شاعرانہ لطائف بیان کئے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔جغرافیائی ماحول کا نفسیاتِ قومی اور حاسئہ مذہبی پر جو اثر پڑتا ہے اس کو جس ادبی صناعت و آگہی سے مرحوم نے بیان کیا ہے اسے ص ے سے ص۹ تک ملاحظہ فرمایئے۔(صفحات کا حوالہ ''باقیاتِ بجنوری'' کے حوالے سے ہے۔زیرِ نظر کتاب میں ملاحظہ فرمایئے ''نسلِ شام کے اجداد'' سے فیضی کے شعر تک)

اسی طرح ''وضعِ اصطلاحاتِ'' کے سلسلے میں جس بے لوث اور مخلصانہ انداز سے مرحوم نے بعض فکر انگیز اور سچے نکتے بیان کئے ہیں وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔یہاں بہت سی ایسی باتیں بھی زیرِ بحث آگئی ہیں جن پر اب صبر و سکوت سے لوگ غور کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتے، حالانکہ ان تمدنی اور علمی مسائل کا حل جلد یا بدیر ان ہی اصول کے ماتحت عمل میں آئے گا۔یہی اور اسی طرح کی باتیں پروفیسر سلیم مرحوم نے اپنی مشہور تصنیف ''وضعِ اصطلاحات'' میں زیادہ تفصیل و وضاحت سے بیان کی ہیں۔

علی گڑھ کا جیسا سچا نقشہ بجنوری مرحوم کی نظر کے سامنے تھا اور وہاں کی عجیب و غریب زندگی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جو ہدایات مرحوم نے

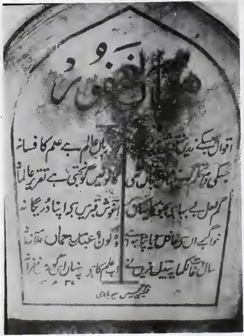
اپنے بھائی حبیب کو دی ہیں اسکی داد کچھ وہی لوگ دے سکتے ہیں جو علی گڑھ میں رہ چکے ہیں۔ بجنوری مرحوم علیگڑھ سے اسی والہانہ گرویدگی کا اظہار کرتے ہیں جو علی گڑھ کے ہر دیوانے وفرزانے میں ملتی ہے؛ چنانچہ یہ اسی شیفتگی کا ردِّعمل ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی ابتدائی اسکیم اوراس کے بانیوں کی بعض کوتاہیوں پر رہ رہ کر پیچ وتاب کھاتے ہیں، اندوہ وآزردگی کا اظہار کرتے ہیں اور کہیں کہیں طعن وطنز کے دلدوز نشتر سے بھی کام لیتے ہیں، لیکن اپنی سنجیدہ منشی اور سنجیدہ اطواری کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیتے۔

یہی باتیں ان کے ''سیرِ لکھنو'' میں ملتی ہیں۔ عام طور پر لوگ اس موضوع پر کُھل کھیلتے ہیں اور جو کچھ لکھنو میں نہیں بھی ہوتا اسے بھی بطور ''لطفِ داستاں'' بیان کرنے لگتے ہیں۔ مرحوم کا یہ مضمون پڑھئے، شاہانِ اودھ کی تصاویر دیکھ کر ایسی باتیں بیان کی ہیں جس سے مرحوم کی دردمندی اور نکتہ رسی کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخی تصاویر کا تاریخ کے پس منظر میں نفسیاتی مطالعہ کرنا بڑا دلچسپ مشغلہ ہے۔

اِس عہد میں اُس عہد کا نقشہ پیش کرنا جب مغربی تمدن کا سیلاب بڑھ رہا تھا اور مشرقی اخلاق واطوار مٹ رہے تھے، اربابِ بصیرت کے نزدیک غالبًا بے موقع نہ سمجھا جائے گا۔ دورِ تصادم یا دورِ عبوری میں بعض



خان بہادر نورالاسلام صاحب — ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری



لوحِ مزار، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، لال گھاٹی، بھوپال

بڑی اہم اور دل آویز شخصیتیں زندگی کے اسٹیج پر نمودار ہوتی ہیں جو بعد میں ''یادگار رونق محفل'' بھی سمجھی جاتی ہیں اور ''نقیب سحر بھی''!

دیکھنا یہ ہے کہ ناظرین کرام ان اوراق میں کس طرح کے نقوش پاتے ہیں اور ایک مکمل تصویر بنانے میں ان سے کیا کام لیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بڈھا مصوّر

آج بہت آدمی حیران ہیں کہ وہ کیا خاص بات تھی جس نے سرسید اور اسکے کام کو دنیا کی نظر میں اسقدر ممتاز بنا دیا اور ان لوگوں کو جو اس کے پائے کو پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں کیوں ناکامی ہوتی ہے۔ ذیل کی سطروں میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

(عبدالرحمٰن بجنوری)

ہندوستان کے کسی شہر میں ایک بڈھا مصور رہتا تھا۔ اس شہر میں اور بھی کئی مصور تھے۔ ایک دفعہ اس بڈھے مصور نے ایک تصویر بنائی۔ اس تصویر میں کچھ ایسی سرخ جھلک تھی کہ جو دیکھتا واہ وا پکار اٹھتا۔ یہ دیکھ کر اور مصوروں نے اس سے دریافت کیا کہ "تو ایسا رنگ کہاں سے لاتا ہے"۔ مصور مسکرایا اور گردن جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

مصوروں میں سے کوئی رنگوں کی تلاش میں چین پہنچا اور کسی نے جاپان اور امریکہ سے نفیس سے نفیس نمونے منگائے۔ سب نے تصویریں بنائیں مگر کسی میں وہ سرخی ظاہر نہ ہوئی جو بڈھے مصور کی تصویروں میں جھلکتی تھی۔ بڈھا مصور برابر اپنے کام میں مشغول رہا۔ اسکی تصویریں روز بروز زیادہ چمک دار اور سرخ ہوتی گئیں اور وہ خود زرد پڑتا گیا۔ مصوروں نے

سبب دریافت کیا مگر وہ مسکرایا اور چپ ہو گیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد وہ بڈھا مصور مر گیا۔ جب اس کے ہم پیشہ مصور اس کی تدفین کے لئے جمع ہوئے تو ان میں سے اکثروں نے اس رنگ کی تلاش میں اس کے تمام برتنوں اور بکسوں کو دیکھا مگر وہ رنگ ہاتھ نہ آیا۔

آخر جب غسل میت دینے کے لئے اس کے کپڑے اتارے تو انھوں نے بائیں پہلو میں عین اس کے دل کے اوپر ایک بہت بڑا اور پرانا زخم پایا جسے موت نے جو سب چیزوں پر مہر لگا دیتی ہے سکیڑ کر بند کر دیا تھا۔ اب مصوروں کو معلوم ہوا کہ وہ اپنا رنگ کہاں سے لاتا تھا۔ آج گو وہ مصور ہم میں نہیں مگر اس کا کام باقی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اردو زبان کی ترقی کے متعلق چند خیالات

(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ''اردو زبان کی ترقی کے متعلق چند خیالات'' کے علاوہ ایک اور مضمون ''وضع اصطلاحاتِ علمیہ'' بھی تحریر کیا تھا۔ ان دونوں مضامین میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ لہٰذا قارئین کی آسانی کے لئے ان دونوں مضامین کو ایک مضمون کی شکل دے دی گئی ہے۔)

اے زبان! تو طاقت میں نمونۂ الٰہی ہے، دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کر اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ (مولانا حالیؔ)

یہ امر ہمیشہ سے تسلیم کیا جا رہا ہے کہ دنیا میں زبان ہی وہ چیز ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ علمائے قدیم انسان کو حیوانِ ناطق سے تعبیر کرتے تھے۔ اب منطق جدید نے انھیں حیوانِ عاقل خطاب دیا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں صرف خفیف لفظی اور ظاہری فرق ہے۔ یہ کچھ نہیں کیونکہ عقل کے اظہار کا ذریعہ منطق ہی ہے اور نطقِ انسانی کا شریف پیرایہ عقل ہے اس لئے حقیقت میں صفاتِ انسانی میں نطق اور عقل ایک دوسرے کے متمم ہیں۔

اقوامِ انسانی کی تفریق اور تقسیم بھی زیادہ تر اختلاف السنہ ہی پر مبنی

ہیں اور قوموں کے باہمی اتحاد میں ہم زبانی کا تعلق بھی نہایت مضبوط اور قوی رشتہ ہے۔ وہ لوگ جو ایک ہی بولی بولتے ہوں خواہ دنیا کے کتنے ہی دور دراز حصّوں اور کیسے ہی مختلف حالات میں کیوں نہ رہتے ہوں پھر بھی ایک قوم کے متفرق ٹکڑے ہیں اور بُعدِ مکان ان کو اسوقت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتا جب تک کہ اختلافِ زبان کا پردہ سدِ سکندری بنکر ان میں حائل نہ ہو جائے۔ دیکھئے جب اسلام کی جہانگیری نے بادیہ نشینانِ عرب کی زبان کو اندلس سے لیکر چین تک مَلک الکلام بنا دیا۔ اور سمرقند اور بخارا سے قرطبہ اور غرناطہ تک علمی دنیا رشتہ ہم زبانی کے نظام میں منسلک ہوگئی تو اس تعلق سے عرب اور عجم کا تفرقہ مٹا کر ترکوں۔ ایرانیوں۔ قبطیوں اور بربریوں کو ایک قوم بنا دیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو دولتِ اسلام سے بہرہ اندوز نہ ہوئے تھے وہ بھی اپنی عقل اور نطق کی بدولت نبی اعمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمنشین بن گئے۔ وہ لوگ جو انگلستان سے نکل کر اقصائے عالم میں پھیل گئے ہیں ان کو اگرچہ ترکِ وطن کئے صدیاں گزر گئیں اور آخر حالات نے ان میں ہر طرح کی تبدیلیاں کر دیں تاہم اتحادِ زبان نے ابھی تک ان کی قومیت کا شیرازہ بکھرنے نہیں دیا اور ان کی ہمدردیاں ابھی تک باہم متحد اور مشترک ہیں۔ علم الاصول میں ملت کا فقط استعمال ہی اس گروہ یا جماعت کے لئے کیا

جاتا ہے جس کی زبان، ملکی اور مذہبی تاریخ ایک ہو۔ گویا اس علم کے مطابق جب تک ہم زبانی کا علاقہ نہ ہوتب تک لوگوں میں خواہ اور کیسے ہی قریبی تعلقات کیوں نہ ہوں پھر بھی وہ ایک قوم اور ایک ملت کے افراد کہلانے کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ زبان ہی وہ معیار ہے جس سے یگانوں اور بیگانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر سیاست کی اساس قائم ہے۔ پان اسلام ازم (Pan Islamism) کا نصب العین اور جرمن رائخ (German Reich) کا خواب اشتراکِ زبان ہی کا نتیجہ ہے اور ہندوستان میں باوجود اتحادِ ملک وحکومت قومیت کا وجود نہ ہونے کی اصل وجہ اختلاف السنہ ہی ہے یہی سبب ہے کہ جو لوگ اپنے ابنائے نوع میں قومیت کی روح دیکھنا چاہتے ہیں وہ سب سے پہلے ان میں ایک زبان پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی سب سے زیادہ عجیب مثال یہ ہے کہ ایک مشہور یہودی مصلح قوم نے بنی اسرائیل کی حکومت دوبارہ قائم کرنے کے لئے اقصائے فرنگ میں ایک جزیرہ خرید لیا ہے گویا ایک عظیم الشان گوروکل بنادیا ہے۔ یہاں پر ملک کے یہودی بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام ہے جو اپنے والدین کے آغوشِ شفقت سے جدا ہوکر تکمیل تعلیم تک اسی جزیرہ میں رہتے ہیں اور یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تمام تعلیم عبرانی میں ہوتی

ہے اور عبرانی کے سوا اور کسی زبان سے بچوں کے گوش ولب آشنا نہیں ہوتے۔

انتہا تو یہ ہے کہ مذہب بھی زبان کے اثر سے محفوظ نہیں ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

خود کلام پاک کا ارشاد ہے۔ ''**وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم**''۔ (سورۂ ابراہیم) جس طرح نطق' انسان کا خاصہ ہے ویسے ہی زبان قوم کا نشان اور سلطنت و مذہب کی روح رواں ہے۔ اور جس طرح ایک جان دوسرا قالب اختیار نہیں کر سکتی اسی طرح کوئی قوم بھی اپنی زبان نہیں بدل سکتی۔ چنانچہ بہت سی قوموں نے جو بزور شمشیر یا بزور قلم دوسری قوموں سے مغلوب ہوگئیں غالب قوم کی زبان اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ سعی ہمیشہ لا طائل اور بے حاصل رہی ہے۔ جب روما نے میدان تیغ میں یونان پر فتح پائی اور میدان علم میں یونان سے شکست کھائی تو یونان کے علمیت کے رعب و اثر میں آکر روما کے بہت سے علمی حلقوں نے ماوری زبان کو ترک کر کے یونانی زبان میں جدوجہد شروع

کروی۔ اس عبث کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ روما کی تہذیب میں انحطاط شروع ہو گیا اور علوم وفنون میں بجائے ترقی کے تنزل کے آثار نمایاں ہو گئے۔ روما کی خوش قسمتی تھی کہ اہل روما وقت پر اس شدید غلطی سے آگاہ ہو گئے۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ انکی ہستی بربادی سے محفوظ رہتی۔ انگلستان میں ملٹن اور شیکسپیر کے زمانہ میں لاطینی شعر گوئی مستحق داد سمجھی جاتی تھی اور مادری زبان کے عمدہ سے عمدہ کلام کی کوئی قیمت نہ تھی۔ آج ہم دریافت کرتے ہیں کہ وہ لاطینی شاعری کہاں ہے؟ عجائب خانوں کی متقفل الماریوں کے سوا اُن دیوانوں کا کہیں نام ونشان موجود نہیں۔ ان بے معنی دفاتر اشعار کی نسبت لاطینی النسل اہل زبان کی رائے ہے کہ یہ مقبول مجموعہ طلباء کی مشق سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن وہ "فردوس گمشدہ" (Paradise Lost) جس کا حق تصنیف ملٹن کو بدقت دو تین پونڈ ملا تھا۔ اور کلیات شیکسپیر جس کو ایک غیر ملک کے باشندوں نے اول مرتبہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور رائج کیا۔ دونوں کتابیں آج انگریزی علمِ ادب کی جان ہیں اور انہیں پر انگریزی ملت کی ہستی معنی آور موقوف ہے۔ پرانے زمانے کی بھولی بسری داستانیں ہم نے اس لئے دہرائی ہیں کہ آج ہماری قوم کی بھی وہی افسوسناک حالت ہے جو ایک زمانہ میں روما اور انگلستان کی تھی اور جس کا تذکرہ ہم نے اوپر کیا ہے۔ آجکل ہمارا

ملک یورپ کی طفلانہ تقلید میں بتلا ہے۔ بلکہ فی الواقع روما، یونانیوں کا اور انگلستان، روما کا اس درجہ غلامانہ مقلد نہ تھا جس قدر ہم یورپ کے کورانہ کفش بردار بنے ہوئے ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں علمی تقلید کا اثر' سیاسی آزادی اور قومی برتری نے ایک حد تک باطل کر دیا تھا۔ اور اگر قلم تعلیم دشمن کے ہاتھ میں تھا تو آج حکومت خود اہل ملک کے قبضہ میں تھی۔ یہاں چونکہ اس قسم کی کوئی بھی تلافی نہیں ہے اس لئے ہم بھی زبان کی طرف سے غفلت میں پڑے رہے تو اس کا انجام ہماری یقینی اور ملی موت ہے۔ کیسی سخت غلطی ہے کہ وہ تمام کوششیں جو ہم کو اپنی مادری زبان اردو کی نشو ونما، ترقی اور تہذیب میں کرنی چاہئیں ایک زبان کی بے نتیجہ تحصیل میں صرف ہو رہی ہیں۔ کیا یہ بات کچھ قرین قیاس ہے کہ مشرقی آب وہوا میں مغربی زبان کا درخت بار آور ہو سکتا ہے۔ زبان فاتح کی تلوار کی آواز کا نام نہیں۔ فاتح اپنا سکہ اور خطبہ جاری کر سکتا ہے۔ لیکن اپنی زبان جاری نہیں کر سکتا۔ مفتوح فاتح کا مذہب اختیار کر سکتا ہے لیکن اس کی زبان اختیار نہیں کر سکتا۔ زبان ملک و ملت کی حرکت کی صدا ہے۔ اور غیر زبان کو رواج دینے کی کوشش خواہ وہ اہل حکومت کی جانب سے ہو ایک فعل عبث ہے۔

انگریزی کے سراب کے تعاقب میں آنکھیں بند کر کے دوڑنا قوم کی

دائمی تشنہ کامی اور شور بختی کا موجب ہوگا اور جب تک سرکردگانِ ملک اس غلط راہ کو جلد از جلد خیر باد کہہ کر صرف اردو کی حمایت۔ حفاظت اور اشاعت میں مصروف نہ ہونگے ان کی تمام رہنمائی غلط اور تمام کوشش ملک و ملت کے حق میں مفید ہونے کی بجائے مضر بلکہ مہلک ثابت ہوگی۔ زبان سے غفلت کا الزام تمام ملک اور قوم کے سر پر ہے۔ کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس کو اس بارہ میں مستثنےٰ سمجھا جائے۔

اردو کا پہلا اور بڑا دشمن ہندو مسلمانوں کا باہمی نفاق ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مادری زبان ہندی ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ اردو ہے۔ محض الفاظ نے دونوں کو مغالطہ دیا ہے۔ اگر دونوں برادرانِ وطن تعصب کی عینک اتار ڈالیں تو حقیقت حال روشن ہو جائے کہ اردو ہندی سے اور ہندی اردو سے الگ زبان نہیں ہے۔ بلکہ ہندی اردو کا اور اردو ہندی کا ہی نام ہے۔ جب اردو کو سنسکرت خط میں لکھتے ہیں تو اسکو ہندی کہتے ہیں اور جب فارسی خط میں لکھتے ہیں تو وہی اردو بن جاتی ہے۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ مسلمان اردو میں ہندی الفاظ کی تعداد کو کم اور عربی اور مشکل فارسی الفاظ کی تعداد کو زیادہ کرتے جاتے ہیں اور ہندو ہندی سے سہل اور رائج عربی و فارسی الفاظ کو خارج اور غیر مانوس اور ادق سنسکرت الفاظ کو ان کی جگہ

داخل کرتے جاتے ہیں۔ اگر یہ افراط وتفریط یوں ہی جاری رہی تو اردو اور ہندی سچ مچ دو جداگانہ اور مختلف زبانیں بن جائیں گی۔ ہندو اور مسلمانوں کو اس غلطی سے متنبہ ہونا واجب ہے کیونکہ دونوں کی یہ نادان دوستی ملک و زبان دونوں کے حق میں عین دشمنی ہے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے زبان خیالات کا بیرونی پردہ ہے۔ اس قسم کا اختلاف بے دلیل ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ مسلمان شعرا بسنت اور ہولی کے قصائد لکھتے تھے۔ کنہیا جی کی مداحی میں نظیرا کبر آبادی کا درجہ سورداس سے کم نہیں۔ ہندو شعرا اپنا کلام ہمیشہ حمدِ الٰہی اور جناب رسالت مآب ﷺ و جناب امیرؓ کی منقبت سے شروع کرتے تھے۔ کیا کوئی بھول کر بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ مسلمان شعرا مسلمان نہ تھے یا ہندو شعرا ہندو نہ تھے۔ سچے مذہب کو کبھی بلند نظری اور رواداری سے نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ کور بینی اور تنگ خیالی ہی اس کی اصل دشمن ہے۔

دیکھئے براعظم یورپ میں کس قدر مختلف النسل اقوام آباد ہیں۔ اس اختلاف کے باوجود جن اسباب نے مغربی تہذیب کی بنیاد ڈالی ہے اس میں اہم ترین عیسوی مذہب، یونانی علوم اور لاطینی زبان کا عام رواج ہے۔ اطالوی۔ فرانسیسی۔ رومانی اقوام کے علاوہ جو لاطینی النسل ہیں نہ صرف اینگلوسیکسن اور ٹیوٹن بلکہ سلاو اور مجار (ہنگیرین) اقوام تک لاطینی زبان

سکتی ہیں۔ جو حالت لاطینی کی یورپ میں ہے قریب قریب وہی حالت فارسی کی ہندوستان میں تھی۔ فارسی مختلف اقوام میں رشتۂ اخوت تھی۔ نہ صرف ممالک شمالی اور مغربی میں بلکہ اقصائے ملک میں سب اقوام فارسی کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔لیکن اب ہندو فارسی کو رفتہ رفتہ ترک کر رہے ہیں۔ مہارشی وو ندرناتھ ٹیگور اور راجہ رام موہن رائے فارسی کے ادیب تھے۔لیکن سرابندرناتھ ٹیگور افسوس کہ فارسی سے نابلد رہے۔ایسی مثال زمانہ کی ہوا کا رخ بتاتی ہے۔

ہر زبان پر تشبیہات کا بھی بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جو زبان جس ملک کی تشبیہات کام میں لاتی ہے اسی ملک کے حالات کے مناسب اور متعلق ہو جاتی ہے۔ اردو کے شعراء اس بات میں قابل الزام ہیں۔ ہندوستان کے شاعر ایران کی تشبیہات کی پابندی کرتے ہیں اور شنیدہ کو دیدہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ جن مناظر و واقعات اور معاملات سے وہ تشبیہہ پیش کرتے ہیں ان کو ہمارے مرز و بوم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ اصل میں مغلوں کی قصیدہ گوئی کا اثر ہے۔ چنانچہ جو شعراء کہ درباروں کے برے اثرات سے محفوظ رہے ان کی شاعری از سرتا پا ملکی اثر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کبیر۔ شہ کمال اور ممتاز کی زبان تمام غیر ملکی اثرات سے آزاد ہے۔ دکن میں بھی ترکی، فارسی کو رواج نہ

تھا۔ بیرونی تشبیہات کم پھیلی ہیں۔ پدماوت اس کا بہترین ثبوت ہے۔ شاہ ولیؔ گو دہلی کے مقلد ہیں لیکن پھر بھی ملکی رنگ رکھتے ہیں۔ کیا خوب شعر کہا ہے۔

پکڑا ہے تری لٹ نے مجھ دل کے کبوتر کو
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑا لے جا

جس طرح ہر بات کا ایک دَور پہلے شروع ہوتا ہے اور پھر دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اردو شاعری کو بھی فارسی کے اس اثر کے دَور سے نکل کر ایک نئے دَور میں قدم رکھنا چاہئے۔ اردو شاعروں کو استعارات کی تلاش میں فارسی کے دواوین کی بجائے اپنے گردوپیش کے مناظرِ قدرت اور مظاہر حیات سے مستفید ہونا چاہئے۔ اس سے شاعری میں نہ صرف تازہ روح پیدا ہوجائے گی بلکہ یہ ادنیٰ فروگزاشت ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا ایک ذریعہ ثابت ہوگی۔

مجموعۂ شاعری کو تو زبان کی ٹکسال کہا جاسکتا ہے۔ جو الفاظ اشعار میں مستعمل ہوں ان سے سند لی جاسکتی ہے اور جو متروک ہوں وہ ٹکسال سے باہر خیال کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن ایک نہایت دلچسپ بات قابلِ غور ہے۔ شاعری بحروں کی پابند ہے۔ بحریں اوزان پر مبنی ہیں اور اوزان کی بنیاد

موسیقی پر قائم ہے۔ ہر ملک کی موسیقی اور بحریں جدا ہیں۔عربی بحریں جدا ہیں۔فارسی جدا۔اردو جدا۔یہی وجہ ہے کہ بعض عربی بحروں میں فارسی شعر نہیں کہا جاسکتا اور بہت سی فارسی بحروں میں عربی شعر موزوں نہیں ہوسکتا۔ اردو شاعری نے اپنی بحریں فارسی سے مستعار لی ہیں اس وجہ سے اردو اشعار میں فارسی الفاظ آسانی سے موزوں ہوجاتے ہیں اور ہندی الفاظ اکثر آسانی سے موزوں نہیں ہوتے۔اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا ہے کہ شدہ شدہ فارسی الفاظ اشعار کے ذریعہ روز بروز زبان زد عام ہونے لگے ہیں۔اور ہندی الفاظ اشعار میں راہ نہ پانے کی وجہ سے ٹکسال باہر ہوگئے ہیں۔اردو زبان کا گو فارسی سے بہت قریبی تعلق ہے لیکن بھاشا سے اس کا رشتہ اس سے بھی زیادہ قریبی ہے۔اس لئے جہاں اردو اشعار فارسی بحروں میں موزوں ہو سکتے ہیں اسی طرح بھاشا میں بھی بہ آسانی ڈھالے جا سکتے ہیں۔چنانچہ نظیر اکبر آبادی نے بدرجۂ کمال اس کا ثبوت دیا ہے۔دولت عثمانیہ میں ترکی شاعری بھی اردو شاعری کی طرح ناحق کمال بے کے زمانہ تک فارسی بحروں کے حصار میں گرفتار تھی۔لیکن اب ترک رفتہ رفتہ فارسی موسیقی کو شاعری میں ترک کرتے جاتے ہیں اور چغتائی بحروں کو جن کو 'برمق جابی' عروض پر قائم کیا گیا ہے رواج دے رہے ہیں۔ہمارے ملک میں بھی ضرورت ہے کہ

کوئی نامور شاعر محمد امین بے کی طرح اردو زبان کو اس بیجا تقلید اور نازیبا قیود سے آزاد کرادے اس کا نتیجہ حلاوت کلام اور وسعت زبان کے علاوہ یہ بھی ہوگا کہ زبان اردو خود بخود سلیس ہوجائے گی۔ اور ہندی اور فارسی زبان سے اس کا تعلق باہم متناسب اور موزوں ہوجائے گا۔

ہندو مسلمانوں کے نفاق کے علاوہ ایک اور نہایت اہم مانع اردو کی ترقی میں مدارس اور مدرسین کی عدم توجہی ہے۔ ہندوستان میں تعلیم گاہیں عموماً دو قسم کی ہیں اول قدیم۔ دوئم جدید۔ اگر قدیم درس گاہوں کی حالت پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کو عربی کے مقابلے میں غیر ضروری اور کم وقعت جان کر اردو کی جانب خیال نہیں کیا جاتا۔ اگر جدید درس گاہوں کی کیفیت کا معائنہ کریں تو ثابت ہوتا ہے کہ اردو کو انگریزی کے مقابلہ میں بے کار اور غیر مفید سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ قدیم معلمین نے جہاں اردو کو اور طریقوں سے نقصان پہنچایا ہے ایک یہ بھی ہے کہ وہ عربی عبارات کو ہمیشہ خلاف محاورہ ترجمہ کرتے ہیں۔ دیوبند اور ندوۃ العلماء اور تمام عربی، فارسی مدارس اور مدرسین پر یہ کتنا بڑا الزام ہے کہ آج تک تفاسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ منطق۔ عام فہم فلسفہ اور ادب کی ضروری سے ضروری کتابیں بھی اردو میں ترجمہ نہیں ہوئیں۔ طبیب آج تک ہندوستان میں

فارسی میں نسخہ لکھتے ہیں۔ دولت عثمانیہ میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ اب سلطان کا حکم ہے، وہاں نسخہ جات ترکی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ جب تک دیوبند، ندوۃ العلماء اور دیگر عربی اور فارسی دارالعلوم ان کا تدارک نہ کریں گے اردو کو کیونکر فروغ ہوسکتا ہے۔ جب تک علوم دینی اور علوم مشرقی اردو میں رواج نہ پائیں گے ملک اور قوم میں کس طرح ہمارے مذہبی اور قومی علوم وفنون کی اشاعت ہوسکتی ہے۔

جدید تعلیم گاہوں کی حالت قدیم تعلیم گاہوں سے زیادہ خراب ہے۔ تمام مدارس، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم غیر زبان میں ہوتی ہے۔ اردو کی تعلیم پانچ سات ابتدائی جماعتوں کے بعد ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ تمام علوم کی تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہے۔ ریاضی۔ تواریخ۔ جغرافیہ۔ منطق۔ سائنس۔ فلسفہ۔ ہر مضمون کی تعلیم انگریزی کے توسل سے ہوتی ہے۔ جو قوم اپنی مادری زبان سے یوں غافل ہو وہ دنیا میں کیا فروغ پاسکتی ہے۔ جس ملک کے لوگ اپنی مادری زبان کو یوں پس پشت ڈال دیں اسکی خاک سے بھلا کوئی فرزانہ اٹھ سکتا ہے؟ جو ملت اپنی زبان کو باعث ننگ اور دوسروں کی زبان کو مایۂ ناز خیال کرتی ہے اس میں کیا خودداری آسکتی ہے۔

جب تک طلباء کو مادری زبان میں تعلیم نہ دی جائے گی تعلیم کسی

طرح جزوحیات نہیں ہوسکتی اوراگر ہمارے طلباء میں سے ہر ایک کے سر میں ہزار دماغ بھی ہوں تب بھی تاوقتیکہ اردو کو ذریعہ تدریس نہ بنایا جائے، بیکار ہیں۔ ہمارے موجودہ طلباء محض طوطے کی طرح آواز لگاتے ہیں اور محض صورت پرست ہیں۔ اوران کا عدم اور وجود برابر ہے۔ بلکہ ان کا وجودان کے عدم سے بدتر ہے۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوتے تو شاید قوائے جسمانی سے تنازع للبقاء میں اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے زیادہ قابل ہوتے۔ ناکمل تعلیم نے ان کو اس قابل بھی نہیں رکھا۔

ہندوستان کے مسلمان فی زمانہ علمی جدوجہد کررہے ہیں لیکن کارکنانِ مدرستہ العلوم اردو زبان کی خدمت سے جس قدر بے پرواہیں شاید ہی کوئی اور طبقہ ہو۔ علی گڑھ کے ماہران تعلیم نے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے متعلق جو پروفیسروں کی طویل فہرست شائع کی ہے اس میں اردو زبان کے پروفیسر کا ذکر نہیں۔ وہ یونیورسٹی جس میں کم از کم دو پروفیسر، ایک نثر اور دوسرے اردو نظم کے موجود نہ ہوں کن معنوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کی یونیورسٹی کہلانے کی سزاوار ہے۔ مجوزین نصابِ مسلم یونیورسٹی نے عربی اور سمیاطیقی۔ انگریزی اور یورپی۔ فارسی اور ایرانی علم اللسان کے اسباب کا مہیا کرنا تجویز کیا ہے لیکن اردو اور ہندوستانی علم اللسان کو اس

فہرست میں شامل نہیں کیا۔ اراکین علی گڑھ کو اپنے اس فرض کا احساس لازم ہے۔ علیگڑھ میں بھی آکسفورڈ کے نثر اور نظم کے پروفیسروں کی طرح اردو نثر اور نظم کے پروفیسر ہونے چاہئیں۔ اور اس فہرست کے لئے ملک کے مشہور ادیب اور شعرا کا ایک سالہ۔ سہ سالہ۔ پنج سالہ انتخاب ہونا چاہئے اور ان کے لیکچروں کا مجموعہ کتاب کی صورت میں یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونا چاہئے۔ عربی اور سمیاطیقی۔ انگریزی اور یورپی۔ فارسی اور ایرانی علم اللسان کی تحقیق اور تعلیم بہت سی یورپ کی یونیورسٹیوں میں ہوتی ہے لیکن اردو اور ہندوستانی علم اللسان کی تعلیم اور تحقیق کا کہیں دنیا بھر میں انتظام نہیں۔ یہ وہ خاص کام ہے جس کو میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا اہم ترین منشاء خیال کرتا ہوں۔ علم اللسان کی رو سے اردو دنیا بھر کی موجودہ زبانوں سے زیادہ اہم اور دلچسپ حیثیت رکھتی ہے۔ اردو کو مکمل حیثیت سے بھاشا اور سنسکرت سے، تواریخی اور سیاسی حیثیت سے فارسی۔ ترکی اور انگریزی سے، اور مذہبی حیثیت سے عربی سے رابطہ ہے۔ زبانِ اردو کی تواریخ ممالک ہندوستان، ایران، عرب، روم اور فرنگ کے زمانۂ موجودہ اور گذشتہ کی تاریخ سے متعلق ہے۔ علی گڑھ کا کام ہے کہ اس عظیم الشان علم اللسان کی عمارت قائم کرے جس کی محض ابتدائی بنیاد کا ایک پتھر مولوی محمد حسین آزاد نے رکھا ہے۔ اور

زبانِ اردو کو محفوظ و مرتب کرنے کے علاوہ دنیا کی معلومات میں اضافہ کرے جو یونیورسٹیوں کے قیام کا اصلی منشاء ہے۔

تیسرا گروہ جو اردو کی جانب سے غفلت کا قصوروار ہے وہ ہمارے نام نہاد جدید تعلیم یافتگان کا گروہ ہے۔ جس کے افراد آنکھیں رکھتے ہیں مگر اردو پڑھنے کے لئے اندھے ہیں، کان رکھتے ہیں لیکن اردو سننے کے لئے بہرے ہیں، زبان رکھتے ہیں لیکن اردو بولنے کے لئے گونگے ہیں۔ ہمارے ملک کے مصنف اور مؤلف انگریزی میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں ہندوستان میں انگریزی کا یہ زور شور ہے کہ ہندوستانی شعراء تک انگریزی میں کلام موزوں کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہمارے اہلِ ملک کی ہر تصنیف جو اردو میں نہ ہو ایک عارضی ہستی رکھتی ہے۔ زمانہ ان تصنیفات کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

اس گروہ کا وقت دن رات انگریزی اور مغربی علم و ادب کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ ان کے کتب خانوں میں عربی اور فارسی کتابوں کا وجود کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو عربی علوم اور فارسی شاعری سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اور جن کو علوم مشرقیہ کی معلومات میں اضافہ کا شوق ہے۔ گفتگو میں وہ علوم و فنون اور حکمت کی اصطلاحات پر تو کیا

روزمرہ کے الفاظ تک پر قدرت نہیں رکھتے۔ ان کی زبان اردو انگریزی الفاظ کا ایک عجب آمیزہ ہے۔ ان کی تقریروں میں جس قدر ریطوریقا (Rhetoric) کا زور بڑھتا جاتا ہے انگریزی الفاظ کی تعداد میں اس ہی نسبت سے اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ان کے اردو اور علومِ مشرقیہ سے اجتناب کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ بزعم خود مشرقی علوم کو پارینہ اور کہنہ خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مغربی علوم ہی جو جدید ہیں تعلیم کے مستحق ہیں۔ اور جدید کو چھوڑ کر قدیم میں وقت صرف کرنا تضیع اوقات کرنا ہے۔ ان کی مجالس میں اکثر اس انداز کی گفتگو ہوتی ہے۔ ''یہ نئی تحقیقات اور نئے علوم کا دور ہے پرانے اور بیکار علوم میں وقت کھونے سے کیا فائدہ''۔

وہ رات ہو چکی وہ فسانے گزر گئے

یہ اپنی زبان میں تعلیم نہ پانے کا اثر ہے کہ ۱۸۵۷ء سے آج تک مغربی تعلیم پانے کے باوجود کوئی قومی اور ملکی ترقی حاصل نہ ہو سکی۔ جاپانیوں نے صرف ستر سال کی جدید تعلیم سے یورپ کی ہم نشینی حاصل کر لی ہے۔ مغرب میں عورتوں کی تعلیم کو صرف چالیس برس ہوئے ہیں اور وہ ملکی ترقی میں بھرپور حصہ لے رہی ہیں۔ جو لوگ اپنے اظہار خیالات کے لئے غیر زبان کے محتاج ہیں اور اگر یہی روش قائم رہی تو آئندہ اور بھی زیادہ دست نگر

ہوں گے۔ ایسے لوگ بھلا کیا قوم وملت کی بنیاد ڈال سکتے ہیں؟ ان کی زندگی ایک تقلیدِ غلامانہ اور ایک انجذاب گدایانہ ہوتی بدیہہ الامر ہے۔ اگر ہماری توجہ انگریزی کو ''میاں مٹھو'' کی طرح حاصل کرنے ہی میں صرف ہوتی رہی تو آج کی اس جہدِ للبقا میں اردو آخر کب تک قائم اور زندہ رہ سکتی ہے؟ ہمارے طالب علم جو ہماری آئندہ نسل ہیں، ہندوستان اور دنیائے اسلام کے آئندہ وارث ہیں، جن سے ہماری تمام آئندہ توقعات وابستہ ہیں جب اپنی مادری زبان سے غافل ہو کر اور اردو کی جانب سے پشت پھیر کر رات دن کی شدید محنت اور سخت آگ اور ظالمانہ ضربات کی مدد سے جب انگریزی تعلیم کی زنجیر تیار کرتے ہیں تو بالآخر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ جس وقت آخری کڑی وصل ہو جاتی ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ زنجیر خود انہیں گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ وہ اعلیٰ ترقی جس کے ہم آرزومند ہیں اردو کی کفِ پا کے نیچے ہے۔ زبان وطن کا کلام ہے اور وطن کا کام وطن کے کلام سے جدا نہیں۔

زبان جسم ہے اور خیالات اس کی روح۔ کسی ملک کی تہذیبی ترقی کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ مادری زبان ذریعۂ تعلیم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن مضامین میں تعلیم دی جائے وہ قومی اور ملکی ضروریات کے

لحاظ سے مقرر کئے گئے ہوں۔ نصابِ تعلیم کوئی ترکہ نہیں ہے، جو ایک نسل سے دوسری کو وراثت میں ملتا ہو بلکہ ہر قوم اور ہر ملت کی ہر نسل کو اپنے نصابِ تعلیم کو از سرِ نو ترتیب دینا ضروری ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اہلِ ملک اور اہلِ قوم اس سے واقف نہیں۔ قدیم درسگاہوں میں اب تک درسِ نظامیہ کی پابندی ہے اور جدید انگریزی مدارس اور کالجوں میں تمام علومِ مشرقیہ ''ٹکسال باہر'' خیال کئے جاتے ہیں۔ محض علومِ مشرقیہ اور عربی کی قدیم تعلیم اس زمانہ میں کئی وجوہ سے غیر مفید اور نقصان دہ ہے۔ عربی تعلیم علومِ جدیدہ کی واقفیت کے بغیر قوم کے حق میں بجائے آبِ حیات کے زہر ہلاہل اور نوشِ قاتل کا اثر رکھتی ہے۔ جب تک علومِ مشرقیہ کا مطالعہ تنقید اور نکتہ چینی کی نگاہ سے نہ کیا جائے گا اور کھرے کو کھوٹے سے جدا نہ کیا جائے گا علومِ مشرقیہ کی جد و جہد میں بجائے آزادانہ اجتہاد کے غلامانہ تقلید اور بجائے علمی ہمت کے علمی پست ہمتی پیدا ہوگی۔ کون نہیں جانتا کہ علومِ عربیہ اور مشرقیہ کے بہت سے حصے جدید تحقیقات کی رو سے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ پس جب تک طالبعلم کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ غلطیاں کیا ہیں اور وہ ان سے اجتناب کر سکے، علومِ مشرقیہ کی تعلیم نیم جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم ایسے سیاسی اور تمدنی حالات میں گرفتار ہیں جہاں زمانے کے ساتھ ساتھ حرکت نہ کرنا موت کے مترادف

ہے۔جسٹس امیر علی اپنی یادگارِ وقت تصنیف میں فرماتے ہیں:۔

''جو قوم اپنے مردہ ماضی کو فرسودہ عبا میں ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہے اس کے نصیب میں ادل ہی سے صفحۂ ہستی سے مٹنا لکھا ہے''۔

چونکہ زمانے کو محض قدیم علوم کی ضرورت نہیں، یہ علوم وجہِ معاش میں بھی بہت کم مدد دیتے ہیں۔آجکل دنیا کی نعمتوں اور قومی آسائش کا مدار تعلیم جدید پر ہو گیا ہے۔جسٹس شاہ دین مرحوم لکھتے ہیں:۔

''وجاہتِ ظاہری لازمی ہے، اسلام کوئی مٹی کی مورت نہیں بلکہ یہ مجموعہ ہے مسلمانوں کی صورتوں کا، اگر مسلمانوں کی صورتیں پاکیزہ ہیں، لباس عمدہ اور شاندار ہیں، چہرے اداس نہیں بلکہ ارغوانی ہیں، بشرے سے آثارِ جاہ و جلال پائے جاتے ہیں تو اسلام کی عزت ہے اور اگر وہ پھٹے حالوں میں ہیں، بھوکے پیاسے ہیں، کمزور و ناتواں ہیں اور دنیا میں ان کی کوئی توقیر نہیں تو اسلام کی ذلت ہے۔دین و دنیا کہنے کو جاہے الگ ہوں مگر دراصل لازم وملزوم ہیں، بلا ترقی دنیاوی ممکن نہیں کہ دین میں شان وشوکت پیدا ہو سکے''۔

لیکن جہاں قدیم تعلیم یافتہ گروہ کا قدیم علوم کو تمام جدید تحقیقات علمی سے بالا خیال کرنا بیجا ہے وہیں جدید تعلیم یافتہ گروہ کا جدید علوم کی خواہ

مخواہ پرستش کرنا بھی غلط ہے، جدید علوم وفنون معاذ اللہ وحیِ خداوندی نہیں ہیں جنہوں نے قدیم علوم کا دفتر مٹا دیا ہو، جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مغربی علوم ہی جو جدید ہیں تحصیل کئے جانے کے مستحق ہیں اور جدید کو چھوڑ کر قدیم میں وقت صرف کرنا تضیع اوقات ہے ان کو باوجود تعلیم پانے کے جاہل سمجھنا چاہئے۔

افسوس کہ یہ حضرات نہیں جانتے کہ جس مغرب کے آستانہ پر وہ شبانہ روز سجدہ کناں ہیں وہ مشرق ہی کا ادنیٰ شاگرد ہے۔ جو بات قدیم مصری کاہن سائس نے یونانی مقنن سولن (Solon) سے کہی تھی وہ نہایت سبق آموز اور ہمارے حسب حال ہے۔

اے اہل یونان تم ہمارے سامنے بچے ہو۔ افلاطون جس پر تم کو ناز ہے ہمارے مکتب کا فرزند ہے۔ تھیبس (Thebes) کے دبستان میں تم سب نے تربیت پائی ہے۔ تمھارا فیثا غورثی فلسفہ ہم ہی نے تم کو تعلیم کیا ہے اور تم کو جو عقل و دانش سے عاری تھے ہم نے ہی غور وفکر کے جوہر سے مزیّن کیا ہے۔ تمھارا اپیکوریَن (Epicurean) فلسفۂ ابتہاج۔ اور تمھارا اسٹوئک (Stoic) فلسفۂ غم ہمارا ہی عطا کردہ ہے ہم ہی نے تم کو رونا اور ہنسنا سکھایا ہے۔ الف سے لے کر (ے) تک جو تمھارا سرمایۂ ناز ہے ہمارا ہی دیا ہوا

ہے۔

کیا ہمارے نوجوان یہ خیال کرتے ہیں کہ جدید علوم وفنون کی وحی خاص طور پر یورپ میں اتری ہے۔ یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ اور ایشیا کے آدمی اپنی دماغی ساخت اور عقلی قویٰ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور دونوں ملکوں کے لوگ جدا جدا قسم کی مٹی سے بنائے گئے ہیں کہ وہ جب تک اپنی عادات واطوار یہاں تک کہ اپنی زبان اور قومیت کو خیر باد نہ کہہ دیں تب تک ایک دوسرے کے علوم وفنون سے واقف اور آگاہ، ہی نہیں ہو سکتے۔

اگر یہ خیال ہے تو قطعاً اور یقیناً غلط ہے۔ خدا نے تم کو بھی ان ہی اجزاء سے بنایا ہے جن سے اہل یورپ بنے ہیں۔ اور تمہارے دل ودماغ میں وہی طاقتیں ودیعت رکھی ہیں جنہوں نے اقوام فرنگ کو اوج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ نہیں بلکہ ایک زمانہ وہ گذرا ہے جبکہ فلسفۂ جدید کے استاد مشرق کے مکاتیب میں کسبِ کمال کرتے تھے اور فنونِ مغرب کے موجد ہمارے اسلاف کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ جب تک دنیا میں تاریخ اور تاریخ میں صداقت کی بو باقی ہے۔ تب تک مغرب کی گردن مشرق کے ربقۂ شاگردی سے آزاد نہیں ہو سکتی اور یورپ کا سر ایشیاء کے بارِ احسان سے سبک دوش نہیں ہو سکتا۔ لیکن، چونکہ اب ہم نے اپنے مایۂ ناز علوم وفنون کو

فراموش کردیا ہے جو ہم کو اپنے بزرگوں سے ترکہ میں ملے تھے۔ اسلئے تعجب ہی کیا ہے کہ اغیار نے ان علوم وفنون میں صدہا قسم کی موشگافیاں اور جدّت طرازیاں کر کے ان کو اپنا کر لیا ہے۔ ایسی ہی غلط فہمیوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے نئے تعلیم یافتہ یورپ کے جدید ترین مسئلہ ارتقا سے جو درحقیقت ان ہی کے بزرگوں کا دریافت کردہ مسئلہ ہے قطعاً ناواقف ہیں اور یوں وہ اپنے علوم سے قطعاً متنفر ہو کر محض مغربی علوم کے گرویدہ و دلدادہ ہو گئے ہیں۔ یہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جس چیز سے اسے خود واقفیت ہوتی ہے اس پر ہمیشہ حصر اور ناز کرتا ہے اور دنیا کو اپنی حد نظر سے محدود جانتا ہے۔ انگریزی طب سے واقف ڈاکٹر جو عموماً بہت معمولی نظریات کا علم رکھتے ہیں اور محض روزمرہ کے کارآمد عملیات سے واقف ہوتے ہیں طبِ یونانی کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ خود ان کا معلم ِ یورپ محمد ابن زکریا رازی۔ علی ابن عباس اور شیخ الرئیس کی آراء کا آج تک پابند ہے۔ مقیاس الحرارت جس پر اسکو اتنا ناز ہے ہمارے ہی اطباء کی ایجاد ہے۔ انگریزی مقیاس کے خلاف جس میں درجۂ صحت (۹۹) دقیقہ (۵) ثانیہ کے قریب ہے۔ مذکورہ مقیاس میں درجۂ صحت ایک مقرر کیا گیا تھا لیکن مجتہدین کی رائے سے مقیاس الحرارت کا استعمال ترک کیا گیا ہے کیونکہ طمس کے اندرونی بخار مقیاس سے

نہیں دریافت ہو سکتے۔ قاثاطیر جو یونانی سے معرب ہے اور کتابت کی غلطی سے بقول مولوی وحیدالدین سلیم صاحب قناطیر مشہور ہو گیا اور جس کو انگریزی میں ''کے تھےٹر'' (Catheter) کہتے ہیں عرب اطباء کے استعمال میں تھا۔ لیکن چونکہ نرم سے نرم قاثاطیر بھی احلیل کو جو ایک نازک ترین حصہ جسم ہے صدمہ پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اس کے استعمال کو بھی ناجائز قرار دیا گیا۔ وہ امراض مزمنہ جن کی تشخیص میں مغربی اطبائے اعظم آج مصروف ہیں اور شعاعیہ (Radium) اور الفیا شعاعوں (Alpha) کی امداد سے کام لینے پر بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ ان کا علاج طب یونانی میں موجود ہے۔ مغربی اور یونانی فنون پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جائیگا کہ یونانی ادویات کے مرکبات اور مفردات کی فہرست بھی کتنی بڑی ہے۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ عقل سلیم اس کو تسلیم کرتی ہے اور مسئلہ ارتقاء کی موجودہ تحقیقات اس کو قرین قیاس کہتی ہے کہ قدرت نے گرم آب و ہوا کے رہنے والوں کا علاج ہزار ہا بلکہ صد ہزار ہا نباتات میں نہ پیدا کیا ہو اور ان کو سرد آب و ہوا کے ممالکِ مغربی کی تجربیات کا محتاج رکھا ہو؟

روما کے قدیم علم فقہ پر آج تمام یورپی فقہ کی بنیاد قائم ہے۔ روما کے مشہور و معروف قانونی ادب میں صرف چند کتابیں:

پنڈکٹ(Digesta or Pandectae)

ناول(Novellae Constitutiones Post Codicem [Novels])

گائس(The Law of Persons by 2nd century jurist Gaius)

جسٹینین(Institutes of Justinian or Institutiones)

وغیرہ ہم تک پہنچی ہیں۔اس کے مقابلہ میں اسلامی فقہ گو مذہبی مسائل سے مخلوط ہے ایک بحرِ ذخار ہے۔ اس وقت یورپ اور ایشیا کے کتب خانے ہماری فقہ کی ہزاروں کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔اگر روما والے دو چار مذاہب میں تقسیم ہیں تو ہمارے فقہا میں کم از کم سو مدارس ہیں۔اگر کوئی خلیفۂ وقت لسطیان کی طرح ان تمام مدارس سے ایک نئے مدرسے کی ترتیب دئے جانے کا حکم دے تو موجودہ زمانہ کے جدید ترین قوانین سے بہتر ایک مجموعۂ قانون مدون ہوسکتا ہے۔ کیا عقلِ سلیم یہی مشورہ دیتی ہے کہ روما کی چند گنی چنی کتابوں کا مطالعہ قانونی علم حاصل کرنے کے لئے کافی ہے؟ کیا ذہن کا یہی تقاضا ہے کہ مسلمان طلباء اپنے قانونی علم کی بنیاد روما کی درسیات پر رکھیں اور اسلامی کتب کو طاق نسیان پر ہی رہنے دیں۔روما کے قوانین کی تحقیق اور جستجو سے ہمیں کیا حاصل ہے۔اسلامی شرع کی چھان بین۔تنقید اور تحقیق سے ہم اسلامی قوانین میں ایک تازہ روح پھونک سکتے

ہیں۔ فلسفہ جس کے ساتھ ہمیشہ لفظِ جدید' کار آمد کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے نہ معلوم کن معنوں میں نیا اور پرانا ہوسکتا ہے اور کس طرح مغرب سے موسوم ہوسکتا ہے۔ وحدت الوجود Monotheism اور تصوف Mysticism میں آج تک کوئی عجمی مسلمانوں سے سبقت نہیں لے گیا۔ اپنشدوں کی تعلیم لافانی ہے۔ جہاں یورپی فلسفے آکر رک جاتے ہیں اور اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں۔ ہندو فلسفہ بے خوف محیط کی انتہا اور الف کی ابتداء تک چلے جاتے ہیں۔ فنون لطیفہ میں جو قومی خصوصیات پر مبنی ہیں۔ مغربی تقلید اگر فضول نہیں تو کیا ہے۔ لیکن تمام ہندوستان قدیم ساز وغنا ترک کر کے مغربی باجوں گاجوں پر فدا ہے۔ سریندر وموہن ٹیگور۔ ڈاکٹر کمار سوامی جیسے ماہرین کی رائے سے عام طور پر واقفیت تک نہیں۔ اسپر عمل کجا۔ افلاطون نے اپنی کتاب سلطنت جمہور میں کیا خوب لکھا ہے۔ ''غیر موسیقی کو اپنے ملک میں دخل نہ پانے دو، کیونکہ یہ رفتہ رفتہ تمام نظام قومی اور آئینی سلطنت کو تبدیل کر دیتی ہے۔ قوانین کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اور ملت کے شیرازہ کو پراگندہ کر دیتی ہے''۔ کچھ موسیقی ہی پر موقوف نہیں جہاں حقیقی لذتِ فردوسِ گوش نہیں وہاں وقوفِ بصر بھی مفقود ہے۔ مجسمہ سازی اور مصوری میں ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان ان مجسمات اور تصاویر کو دیکھ کر

جو عکاسی کے درجہ سے کم بلند ہیں بے خود ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ قدیم یونانی اور جدید اطالوی زمانہ احیاء کا فن جس پر وہ جان دیتے ہیں۔ قدیم مصر اور قدیم ہندوستان کے فن کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ اجنٹا کے غاروں میں جو تصویریں ہیں ان کے رنگوں کی نقل آج تک بیحد کوشش کے بعد بھی یورپ کے مصوروں سے نہیں ہوئی۔ تمام یورپ کے نگار خانوں میں پھر جایئے وہ رنگ کسی مصور کے موء قلم نے نہیں دکھلایا۔ نٹ راجا یا گیانی بدھا سے مائلو کی زہرہ Venus -De-Milo کو کچھ نسبت نہیں۔ لیکن بہت سے جدید تعلیم یافتہ جو یونانی زندگی میں زہرہ کی حیثیت سے بھی واقف نہیں اور اسکو محض ایک بازو شکستہ عریاں عورت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اسیر عیش ہیں۔ حق یہ ہے کہ فدیت (Phidias) اور پالگ ناطش (Polyclitus) قدیم ہندوستان۔ مصر اور اسیریا کے اہلِ فن کی شاگردی کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتے۔

اگر ہم تنازع للبقاء میں اپنی ہستی برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے فلسفے۔ اپنی طب۔ اپنے فنون۔ اپنی فقہ۔ اپنے علوم۔ اپنی حکمت کو زندہ کریں۔ اگر ہمارا فلسفہ ہماری تعلیم کا جزو بن جائے تو وہ خود ہی رفتہ رفتہ مغربی فلسفہ کے اختلاط سے اپنے تمام نقائص سے پاک

ہوسکتا ہے۔ اگر ہماری طب کا احیا ہوتو خود بخود وہ مغربی جراحی کے ان اصولوں کو جو حقیقت میں خود اس کے ہی اصول ہیں اور جن میں یورپ نے صرف اضافہ کیا ہے پھر جزوِ حکمت بنالے گی۔ اور امراض کی جدید ترین تحقیقات پر غور کرنے کے بعد ان میں سے بہت سی باتوں کو اختیار کرلے گی جب ہمارے فنونِ لطیفہ جن کی بنیاد علویت اور روحانیت پر ہے مغربی فنون کو اپنائیں گے، وسیع تر بنیاد پر قائم ہونگے، تو اس سے لازمی ہے کہ یورپ اور ایشیا دونوں کے موجودہ فن سے ایک زیادہ عظیم الشان فن کی بنیاد قائم ہوگی۔ جب ہم مغربی فقہ کی تدوین کریں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم مثل اہل روما، اقوام کے ایک یادگارِ زمانہ جدید قانونِ اسلامی کے بانی نہ ہوں۔

علوم کی حالت جامد اجسام کی سی نہیں ہے جو ایک دوسرے کا جزوِ بدن نہیں ہوسکتے بلکہ پودوں کی سی ہے جن میں باہم پیوند لگایا جاسکتا ہے۔ مقامی علوم کے احیاء کے لئے لازمی ہے کہ علومِ مشرقیہ کی شاخِ کہنہ میں علومِ جدیدہ کی قلم لگائی جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایشیائی قدیم نقطۂ نظر اور یورپی جدید نقطۂ خیال کا اجتماعِ سعدین ہو تاکہ ہمارے اسلاف کے علوم وفنون جو بقول مولانا نذیر احمد خدانخواستہ بے جان اور مردہ نہیں ہو گئے بلکہ صرف ٹھٹھر گئے ہیں پھر تندرست وتوانا ہوجائیں۔ یہ جب ہی ہوسکتا

ہے کہ علومِ مشرقی کے سرد جسم میں علومِ مغربی کا گرم خون پہنچایا جائے، اس عظیم الشان مقصد کی تکمیل کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ علومِ مغربیہ اور علومِ مشرقیہ کا مطالعہ ساتھ ساتھ کیا جائے تا کہ دونوں کے بہترین حصص خود بخود رفتہ رفتہ یک جان ہو جائیں اور ایک نئی تہذیب کی عبارت اور ترتیب کا ذریعہ ہوں۔

ہمارے ایشیائی اور اسلامی علوم ہماری ملت اور قومیت کی اصلی بنیاد ہیں اگر ان کا احیا نہ ہوا تو ہم دنیا میں یورپ کی ایک پژمردہ نقل بن کر رہ جائیں گے جس کی یورپ کو کوئی ضرورت نہیں اور زمانہ ہمارے نام اور ہماری ہستی کو مٹا دے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم مغربی اور جدید علوم کی ضرورت سے آزاد ہیں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ جب تک مشرقی اور مغربی علوم ساتھ ساتھ نہ پڑھائے جائیں گے تعلیم ہمارا جزو زندگی نہ ہوگا۔ ہمارا نام نہاد فضل و کمال نقش بر دیوار ہوگا۔ اور ہمارا وجود خود دنیا کے لئے بیکار ہوگا۔

قدیم علوم کی قریب قریب تمام کتابیں عربی میں ہیں، جدید علوم کی کتابیں یورپ کی مختلف زبانوں میں ہیں۔ اردو میں نہ قدیم مشرقی علوم کی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں نہ جدید مغربی علوم کی۔ ہم اپنی مادری زبان اردو میں نہ قدیم یونانی علوم کے (جن کو مسلمانوں نے اختیار کیا اور فروغ دیا تھا) اور

نہ موجودہ یورپی علوم کے ہی (جو اس وقت تمام دنیا کی زبانوں میں شائع ہیں) مالک ہیں۔

میں یہ کہتا ہوں کہ علوم شرقیہ اور غربیہ کی تعلیم پہلو بہ پہلو ہونی چاہئے۔ اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ بیس برس کے اندر اندر ایسی ایسی تصانیف اور تحقیقات ہم سے ممکن ہونگی کہ یورپ قدر کرے گا اور جو دنیا کے علم میں اضافہ کا باعث ہوں گی۔ لیکن خود مغربی علوم کی تحصیل کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم اردو تراجم کے ذریعہ سے دی جائے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا۔ جدید علوم انگریزی دانوں کے محدود حلقہ میں محصور رہیں گے۔ اور قوم میں بحیثیت قوم ان کی اشاعت ممکن نہ ہوگی۔ اگر ہم اس امر کے خواہش مند ہیں کہ فریڈرش نطشے (Friedrich Nietzsche) کے فلسفہ کے مطالعہ سے ہماری قوم میں جو عصبی کمزوری آ گئی ہے اس کا علاج کیا جائے تو جب تک اس کی کتابیں اردو میں ترجمہ ہو کر شائع نہ ہوں یہ ممکن نہیں۔

بعض اشخاص نہایت غلط دلیل انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قائم رکھنے کی یہ دیتے ہیں کہ انگریزی علوم کو انگریزی میں تحصیل کرنا مناسب ہے۔ علوم بحر و بر کے حصص نہیں ہیں جو ممالک کے حدود اربعہ کے لحاظ سے علٰیحدہ علٰیحدہ

تقسیم کئے جاسکیں۔ انگریزی اور علوم یہ دونوں الفاظ مشکل سے جمع ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ان کو یکجا کیا جائے تو ایک حد تک بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ اصول قرار دیدیا جائے کہ جملہ علوم کی کتابوں کا مطالعہ اصل زبان میں کرنا چاہئے تو ہر جدید علم کے جاننے کے لئے ضروری ہے کہ یورپ کی جملہ زبانوں سے واقفیت ہو۔ اور جسے تمام السنۂ مغربیہ پر عبور نہ ہو گویا وہ کسی جدید علوم کے مطالعہ کا حق ہی نہیں رکھتا۔ فی زمانہ کسی معرکتہ الآراء بحث کو لے لیجئے خواہ وہ فلسفہ میں ہو یا حکمت میں۔ کسی جدید مسئلہ پر غور فرمائیے خواہ علوم سے متعلق ہوں یا فنون سے۔ کسی جدید اصول یا دریافت یا اختراع پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ فی زمانہ کوئی مغربی علم ایسا نہیں جہاں ایک شخص یا متعدد ماہرین نے اس کے متعلق نہیں لکھا اور اسکی معلومات میں اضافہ نہیں کیا۔ اس لئے فی زمانہ ہر مضمون سے تمام وکمال واقفیت اصل کتابوں کے مطالعہ سے دس پانچ مغربی زبانیں جاننے پر بھی ناممکن محض اور محال قطعی ہے۔ جب تک تراجم اور محض تراجم نہ ہوں علوم صحیحہ کی تعلیم ہو ہی نہیں سکتی۔ کیا آپ کوئی علم اور حکمت کی شاخ ایسی بتلا سکتے ہیں جس کے مطالعہ کے لئے انگریز غیر زبانوں کے محتاج نہیں۔ اگر کوئی شخص آجکل اپنی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر بطور مثال صرف جدید فلسفہ سے واقف ہونا چاہے تو اس کے

لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم بیکن (Bacon) بروے (Broome William) وغیرہ سے واقف ہو۔ جن کی اصلی تصنیفات لاطینی میں ہیں۔ وے کارت (Descartes)۔ روسو (Rousseau)۔ کامت (Comte Auguste) وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصلی تصنیفات فرانسیسی میں ہیں۔ کانت (Immanuel Kant)۔ ہیگل (Hegel)۔ فشتے (John G. Fichte)۔ شلیگل (Schle'gel) وغیرہ سے واقف ہو جن کی اصلی تصنیفات المانی میں ہیں۔ اسپی نوزا (Spinoza) سے واقف ہو جس کی اصلی تصنیفات ولندیزی میں ہیں۔ کروچے (Croche,Benedetto) سے واقف ہو جس کی اصلی تصنیفات اطالوی میں ہیں وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ تمام جدید فلسفے سوائے برکلے (Berkley)۔ مل (Mill)۔ اور اسپنسر (Spencer) کے، انگریزی کے علاوہ دیگر یورپین زبانوں میں ہیں۔ اگر صرف اصل زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے تو علمی دنیا میں قیامت برپا ہو جائے۔ اور تمام علمی تحقیقات ایک دن میں بند ہو جائیں۔

اب یونیورسٹیوں میں مغربی ادب کی تعلیم کے مسئلہ کو لیجئے۔ چونکہ اس کا تعلق ترجمہ کے مسئلہ سے ہے اسکو یہاں بیان کرنا موزوں نہیں خیال کرتا۔ ہماری ہندوستانی یونیورسٹیوں میں چونکہ انگریزی زبان کے پروفیسر

اردو سے ناواقف انگریز ہوتے ہیں وہ انگریزی سے انگریزی میں سبق دیتے ہیں۔ ہمارے ماہرین تعلیم ایک لحظہ کے لئے اتنا غور نہیں کرتے کہ اس سے زیادہ غلط طریقہ کیا ہوسکتا ہے۔ اس طریقہ کا رواج صرف اس وجہ سے ہے کہ انگریزی کے لئے دوسرا طریقہ ممکن نہیں۔ ہندوستان میں استاد طلباء کے لئے نہیں بلکہ طلباء استاد کے لئے ہیں۔ اگر شیکسپیئر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے پڑھایا جاتا اور اس طرح انگریزی ادب کی تمام کتابیں اردو میں ترجمہ ہو کر تعلیم ہوتیں تو آج انگریزی علم و ادب تمام خود بخود ترجمہ ہو چکا ہوتا' خود ہمارے ادب پر نہایت مفید اثر پڑتا اور ہم انگریزی ادب کے حقیقی مفہوم سے بھی ضرور قریب تر ہوتے۔ اگر فرانس یا روس میں آپ یہ تجویز کریں کہ فرانسیسی اور روسی یونیورسٹیوں میں انگریز پروفیسر انگریزی زبان میں تعلیم دے تو آپ کی ہنسی اڑائی جائے اور خدانخواستہ لوگ آپ کو دیوانہ خیال کریں۔ پروفیسر برگسان (Bergson) مشہور زمانہ فلسفی جب یورپ اور امریکہ جاتے ہیں اور وہاں کی یونیورسٹیوں میں ہزاروں پونڈ معاوضہ لے کر لیکچر دیتے ہیں جو لکھا ہوا ہوتا ہے اور پڑھا جاتا ہے تو باوجود اعلیٰ ترین انگریزی دانی کے فرانسیسی زبان میں لکھ کر پڑھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیشتر حاضرین فرانسیسی زبان سے ناواقفیت کے باعث ان کی تقریروں کو

سمجھ نہیں سکتے لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم انگلستان یا امریکہ میں بھی انگریزی میں تقریر کرنا، گو اس سے ہماری زبان دانی کی شہرت ہی کیوں نہ ہو، اپنی زبان کی حیات اور اشاعت کے منافی جانتے ہیں۔

علمی کتابوں میں جو ادب اور شاعری کے علاوہ اور تمام مضامین پر مشتمل ہیں ترجے اور اصل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بلکہ چونکہ مصنفین جو ماہر ہوتے ہیں اور تمام عمر ایک مضمون کی تکمیل میں صرف کرتے ہیں اور ادب کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں رکھتے اپنے مطالب کو فصاحت اور بلاغت سے بیان نہیں کر سکتے۔ مترجم جو عموماً ادیب ہوتے ہیں اپنے ترجے کو اصل کے انتقاع سے پاک کر دیتے ہیں اور ترجے عموماً اصل سے بڑھ جاتے ہیں۔ لہٰذا مغربی علوم سے بھی کماحقہ واقفیت جب ہی ہو سکتی ہے جب اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ ہر ایک قوم کی زندگی میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے جب تاریخی اور سیاسی اسباب سے علوم وفنون کی روشنی کم ہو جاتی ہے اور اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے چراغ کو اور اقوام کے چراغ سے روشن کرے۔ اس زمانہ میں تخلیق کی قوت زائل ہو جاتی ہے جو تصنیفات ہوتی ہیں وہ ادنیٰ درجے سے آگے نہیں جاتیں الا ماشاء اللہ۔ عوام کا مذاق درست نہیں رہتا۔ ایسے زمانہ میں ضروری ہے کہ کتابوں کے لکھنے والے بجائے اس کے

کہ اپنے خام یا نیم پختہ خیالات کا اظہار کریں۔ دنیا کے اور مشہور گزشتہ اور موجودہ مصنفین کے ترجمان ہو جائیں۔

ہر زبان کی مثال ایک خارجی ظرف کی سی ہے اور علم جو مظروف ہے کسی خاص ظرف کا پابند نہیں۔ جیسے پانی کو جس وقت چاہیں ایک برتن سے دوسرے برتن میں منتقل کر سکتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح ہر علم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر سکتے ہیں۔

گو ہم میں ہر شخص اس بات کا مشتاق ہے کہ وہ خود مصنف ہو اور مترجم یا مؤلف ہونا اپنی کسر شان خیال کرتا ہے مگر یہ خیال غلطی پر مبنی ہے۔ آج یورپ میں مترجم بھی وہ پایہ رکھتا ہے جو خود مصنف کا ہے۔ اکرٹ (E'ckhart) دیوان حماسہ کا مترجم المانیہ کے مشہور شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ ولیم آرچر (Archer,William) کی شہرت اس بنا پر قائم ہے کہ وہ ناروے کے ایک ڈراما نویس ابسن (Ibsen) کا انگریزی مترجم ہے۔ اس غلط خیالی کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ناواقف لوگ ترجمہ کو ایک بہت سہل کام سمجھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس سے واقف ہیں وہ اسکی مشکلات کو اصل تصنیف سے کم نہیں بلکہ زیادہ جانتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جو حالت آج ہے وہ اس امر کی مقتضی ہے کہ عموماً تراجم کو تصانیف پر ترجیح دی جائے۔ سوائے

معدودے چند لوگوں کے جن کو قدرت نے اعلیٰ ترین دماغوں سے مزین کیا ہے اور اپنے خاص پیغام پہنچانے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ ہمارے ملک کے لوگوں کو ترجمہ کی جانب توجہ کرنی چاہئے۔ آج سے تیس برس بعد موجودہ مصنفین جن کے تصنیف کردہ ناول اور افسانے آجکل ہر گلی کوچہ میں ردی کے بھاؤ بک رہے ہیں ہمیشہ کے لئے فراموش کردئے جائیں گے۔ بلکہ زبانِ اردو کے مورخین ان کے وجود کو باعث ننگ خیال کریں گے۔ اور ان کو کیڑوں سے تشبیہہ دیں گے جو بارش میں زمین کے متعفن ہوجانے سے پیدا ہوجاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جہاں حالیؔ اور شبلی کا نام قائم و دائم رہے گا اسی طرح سید علی بلگرامی مترجم تمدنِ عرب۔ مُلا غلام الحسنین مترجم فلسفۂ تعلیم۔ ابوالمعانی نیاز مترجم گیتان جلی کے نام ہمیشہ تذکراتِ اردو میں عزت کے ساتھ لئے جائیں گے۔

جن حضرات نے ترجمہ کے کام کو کیا ہے ان کو یہ شکایت ہے کہ اصطلاحاتِ علمیہ کی تلاش اور ایجاد میں سخت مشکل ہوتی ہے۔ میری رائے میں یہ اشکال خود ہی ترجمہ کے کام کو زیادہ قابل عزت و وقعت بنادیتے ہیں کیونکہ اس قسم کی مشکلات کو حل کر کے گویا مترجم کی زبان عمارت پر نئے نقش و نگار بنا دیتی ہے اور آئیندہ نسلوں کے واسطے ترقی زبان کے راستے صاف

کردیتی ہے۔

جدید علوم وفنون کی مصطلحات اور علمی لغات یورپ کی زبانوں میں زیادہ تر لاطینی اور یونانی الفاظ سے مرکب ہیں اور ہماری زبان میں عربی، فارسی یا ہندی رائج ہوسکتی ہیں، حاصلِ کلام اردو زبان کی اس خدمت کے لئے ایک ایسی جماعت تیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں ماہرین کے علاوہ عربی، فارسی، یونانی، لاطینی، انگریزی اور جرمن زبان کے جاننے والے موجود ہوں۔

اصطلاحات کے متعلق بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان کے انتخاب یا اختراع کرنے والے ماہرین فن (Experts) ہونے چاہئیں۔ یعنی جس علم یا فن کی اصطلاحات مطلوب ہوں ان کو اس فن کے ماہرین بنائیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ہمارے اکثر پروفیسر جو علوم مغربیہ میں تعلیم دیتے ہیں اپنی زبان میں اصطلاحات وغیرہ سے کم واقف ہیں۔ بلکہ خود انگریزی میں علم اللسان کے نقطۂ نظر سے لاطینی یا یونانی اصطلاحات نہیں جانتے۔ یہ کام علم اللسان کے جاننے والوں کا ہے اور میں نے یونیورسٹی کے نظام میں جو اصلاحات پیش کی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ Doctor of Language کی ڈگری کو اسطرح ترمیم کیا جائے کہ جو لوگ اس سند کو حاصل کریں وہ مغربی تراجم کے

لئے خاص طور پر موزوں ہوں۔

بعض مشرقی اقوام نے مثلاً میں نے استنبول میں خاص طور پر حکمت Science کی کتابیں خرید کر دیکھا۔ انگریزوں کی طرف سے آکسیجن۔ ہائیڈروجن وغیرہ وغیرہ الفاظ کو ویسے کا ویسا ہی اپنی زبان میں لے لیا ہے یہ محض ان کی پست ہمتی اور نارسی کی دلیل ہے۔ انگریز تو یونانی اور لاطینی کو اختیار کر چکے اور وہ ان کی زبان کا جزو ہو چکیں۔ لیکن ہمارے لئے ابھی انتخاب کا موقع ہے۔ ایسی صورت میں جب تک کہ یہ بات یکساں ہماری قدرت میں ہے کہ چاہیں تو یونانی اور لاطینی الفاظ اور اصطلاحات کو لے لیں اور چاہیں تو خود اپنی زبان میں ترجمہ کر لیں۔ ہمارا انگریزوں کی تقلید کرنا سخت غلطی ہوگی۔ جرمنوں نے جو علمی حیثیت سے ایک نئی قوم ہیں ایسا نہیں کیا بلکہ سب اصطلاحات کو اپنی زبان میں ترجمہ کر لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جرمن بچہ محض اصطلاح سنتے ہی آکسیجن کا مفہوم پالیتا ہے۔ ہم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔ ترجمہ کرنے میں دو طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ عربی اصطلاحات بنائی جائیں۔ دوسرے یہ کہ فارسی اصطلاحات کو اختیار کیا جائے۔ عربی الفاظ کو ترجیح دینے والے یہ وجوہ پیش کرتے ہیں کہ عربی زبان میں تمام علوم کی اصطلاحات موجود ہیں جو صرف مرور زمانہ سے غیر مستعمل

ہوگئی ہیں ان کو تلاش کر کے دوبارہ زندہ کرنا کافی ہے۔اس طریقہ کو اختیار کر کے دس بارہ برس میں علوم قدیمہ اور جدیدہ میں ایک خالص اتصال پیدا ہو جائیگا۔ دویم اہل بیروت اور اہل مصر نے اکثر جدید اصطلاحات وضع کر لی ہیں وہ ہمارے کام آسکتی ہیں اور بہت سی محنت بچ سکتی ہے۔ فارسی اصطلاحات کے مویئد یہ کہتے ہیں کہ عربی اصطلاحات کو اختیار کرنے سے وہی قباحت ہے جو انگریزوں کو لاطینی اصطلاحات کی وجہ سے باقی رہتی ہے اور وہ آسانی جو جرمنوں کو خاص جرمن اصطلاحات سے ہے پیدا نہیں ہوتی۔ لغات علمیہ کی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص ان کو بہ آسانی سمجھ لے۔ اگر اردو میں ایسی مصطلحات کو رواج دیا جائے جن کا مفہوم پانے کے لئے اول عربی زبان کا سیکھنا لازم ہو تو یہ لغات کسی طرح ہماری زبان، ہمارے ملک کے لئے موزوں نہیں ہو سکتیں۔ عربی لغات اختیار کرنے میں یہ مشکل ہے کہ وہ عام فہم نہیں۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ کون شخص ایسا ہے جو عربی زبان جانے بغیر ذیل کے الفاظ کے معنی سمجھ سکتا ہے؟ مثلاً حیوانات میں (یہاں ایک کتاب سے مثال دی جاتی ہے) کثیرۃُ الرجل یا اُخطبُوطیہ۔ شوکۃ الجلد۔ مُستَعلِجُ الجلد۔ مُستقیمۃ الاَجنحۃ الفاظ کا عام طور پر سمجھانا اور رواج پانا مشکل ہے۔ لیکن کثیر پا۔ خار پشت۔ گداز جلد۔ غلاف پوش۔ راست پر کے معنی ہر

شخص سمجھتا ہے اور ایسی اصطلاحات بہت جلد قبول عام کا خلعت پا سکتی ہیں۔
میری قاصر رائے یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ جہاں فارسی اصطلاحات موزوں مل سکیں ان کو ترجیح دینا چاہئے۔ اس کے ساتھ عربی قدیم اصطلاحات کو جو مفرد الفاظ کی صورت میں ہوں اختیار کرنا چاہئے اور ایسے الفاظ جو ہماری زبان کے اعتبار سے سخت نہ ہوں اختیار کرنا چاہئے۔ فارسی زبان میں جرمن کی طرح یہ خوبی ہے کہ جن دو لفظوں کو چاہئے فوراً ملا کر ایک مرکب لفظ یا اصطلاح بنا لیجئے۔ عربی میں یہ بات نہیں۔ ہماری زبان میں عربی اصطلاحات ذرا ثقیل بھی معلوم ہوتی ہیں۔

اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ انگریزی مصطلحات ہی بجنسہٖ اختیار کر لی جائیں۔ گو ایسا کہنا کوئی فخر کا باعث نہیں تاہم ہمارے ملک کے لوگ انگریزی مصطلحات سے کم از کم عربی مصطلحات کی نسبت زیادہ واقف ہیں۔ ہندی الفاظ اور مصطلحات اختیار کرنے میں یہ دقت ہے کہ لطافتِ زبان بالکل جاتی رہتی ہے۔ مثلاً

ہندی لفظ

روکڑ سرمایہ Capital

ایک منطق کے رسالے میں Contrary (نقیضِ اجمالی) اور

Contradictory (نقصِ تفضیلی) کا ترجمہ ''آدھا توڑ'' اور ''پورا توڑ'' کیا گیا ہے۔

ہم کو چاہئے کہ تمام علوم وفنون کی مصطلحات کو اپنی قدیم اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی کتابوں میں تلاش کریں۔ بہت سے علمی لغات موجود ہیں مگر پرانی کتابوں میں دبے پڑے ہیں، ان بے بہا موتیوں کو اُن تاریک گہرائیوں میں سے نکالنا چاہئے۔ سائنس کی مصطلحات بھی بہت سی موجود ہیں صرف ان کو تلاش کر کے رواج دینے کی ضرورت ہے۔ نباتات کی بہت سی مصطلحات میزان الادویہ میں مل سکتی ہیں کیوں کہ ہماری طب کی تقریباً تمام ادویہ نباتی ہیں۔ اگر الفاظ نہ مل سکیں تو ان کو خود بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انگریزی یا جس یورپی زبان کا لفظ ہو اس کے اجزاء کی تحلیل کر لینی چاہئے اور پھر اس کے لاطینی یا یونانی وغیرہ مادے کے لحاظ سے اس کا ترجمہ کرنا چاہئے۔

مثالیں

Graph	Phono	Phono-graph
نگار	آواز	

Phone	Tele	Tele-Phone
گو	دور	
Sprecher	Fern	Fernsprecher
گو کہتے ہیں	دور	جرمنی میں اسی لحاظ سے
Mobile	Auto	Auto-Mobile
رواں	خود	
Scope	Tele	Telescope
بین	دور	پہلے سے موجود ہے۔

پس کام اتنا مشکل نہیں جیسا نظر آتا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا اصطلاحات کی لغت پہلے تیار ہونی چاہئے یا پہلے ان مختلف مضامین کی کتابیں لکھی جائیں اور ان میں حسب ضرورت اصطلاحات استعمال کی جائیں پھر جب رفتہ رفتہ ان میں ترقی ہو تو ان کی تدوین سے لغت کی کتاب بنائی جائے۔ اس خیال کے موئید کہتے ہیں کہ اگر لغت پہلے سے تیار ہو تو وہ ناقص ہوگی اور اسطرح ناقص اصطلاحات رواج پا جائیں گی۔ اس لئے لغت میں صرف انہیں الفاظ کو جگہ دینا چاہئے جو وقت کی کسوٹی پر کسے جانے کے بعد مقبول ہو جائیں۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ لغت کی کتابوں کے متعلق ایک مغالطہ ہے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ لغت ایک ٹکسال ہوگی اور اس کے بعد مصنفوں ۔ مولفوں ۔ مترجموں کو کوئی اصطلاح ٹکسال سے باہر لکھنے کی اجازت نہ ہوگی ۔ جو لفظ یہاں جس معنوں میں استعمال ہوگا وہی سب کو قبول کرنا پڑیگا ۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کہ مولوی عبدالحق صاحب کا جنہوں نے اس عظیم الشان کام کو پورا کرنے کا تہیہ فرمایا ہے ۔ یہ منشاء ہرگز نہیں ۔ ایسا خیال کرنا ابھی قبل از وقت ہے ۔ منشاء صرف اتنا ہے کہ لغت ساز مصنفوں اور مترجموں کی امداد کے لئے امتحان اور آزمائش کے طور پر الفاظ پیش کریں گے اور مصنف ، مولف اور مترجم ان کی محنت سے مستفید ہونگے لیکن اصطلاحات کی اصلاح و ترمیم اور قطع برید کا ہر حال میں ان کو اختیار ہوگا اور وہ کسی طرح اس کے پابند نہ ہونگے کہ مجوزہ الفاظ کے سواء اور کوئی لفظ بھی استعمال نہ کریں ۔ یہ کتابِ لغت ابتدا میں ایک خاکہ ہوگا ۔ اس پر الفاظ کی رنگ آمیزی مصنفین کے مذاقِ سلیم اور انتخاب صحیح پر منحصر ہوگی ۔ اور یوں اگر دونوں فریق ایک دوسرے کے مشیر رہے تو دس بارہ برس میں ایک عمدہ کتابِ لغت بھی تیار ہو جائے گی اور وہ وقت آجائے گا کہ الفاظ کے معنی کو مقرر کر دیا جائے ۔

اکثر یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ جدید اصطلاحات کی لغت کی کتابیں

ترکی۔ فارسی۔ عربی میں موجود ہیں یا نہیں۔ میں نے ان کے متعلق جہاں تک واقفیت بہم پہنچائی ہے وہ یہ ہے کہ ۱۸۷۲ء میں ایک کتاب فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی ہے جس میں انسانیات Anthropology اور طبِ مغربی کی اصطلاحات فرانسیسی۔ انگریزی۔ المانی اور فارسی میں ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں جدید مصطلحات کی کوئی لغت نہیں۔ عربی میں بیروت میں چند لغت شائع ہوئی ہیں جن کی کیفیت یہ ہے۔ یونس معلوف نے ایک لغت عربی الموسوم بہ المنجد ۱۹۰۸ء میں شائع کی ہے اس میں الفاظ کے معنی عربی میں درج ہیں۔ اور اس میں Technical اور Scientific اصطلاحات بھی شامل ہیں۔ ایک اور مفید لغت جس میں بعض انگریزی اصطلاحات کے عربی مترادف الفاظ موجود ہیں الکارلوئیس (Father Carlouis) ۱۸۹۳ء کی ہے۔ مصر میں ایک لغت سیرو کی ہے جو قاہرہ سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ پراٹسٹنٹ کالج بیروت نے مختلف علومِ جدیدہ کی شاخوں پر تیس چالیس برس کا عرصہ ہوا ابتدائی کتب لکھوائی ہیں ان سے بھی مدد مل سکتی ہے لیکن بہت کم۔ دائرۃ المعارف بیروت بھی اس نقطۂ نظر سے قابل توجہ ہے۔ پرانی کتابوں میں الخوارزمی کی کتاب مفتاح العلوم اور ایسی بیسیوں کتابیں لائق غور ہیں۔ ان میں سے بہت سی اصطلاحات مل سکتی

ہیں جن کو رواج دینا ممکن ہے۔ ایک کتاب جس کی تعریف میں نے سنی ہے اور جو غالباً ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود ہے۔

A Dictionary of the Technical terms used in the Sciences of the Mohammadans (Calcutta 1862)

اصطلاحات سازی کے لحاظ سے ناگری پر چارنی سبھا اور خصوصاً گروکل ہردوار کی کتب اور درسیات توجہ کی طالب ہیں۔ میں نے گروکل میں پروفیسر مہیش چرن سنہا صاحب کو ہندی میں نہایت روانی اور خوش اسلوبی سے نباتات پر طلباء کو لیکچر دیتے سنا ہے۔

ایک اور مشکل جو علوم کی اشاعت کی راہ میں حائل ہے وہ ٹائپ کی عدم موجودگی ہے۔ فی زمانہ کتابیں رسالے اور اخبار سنگ نویسی کے ذریعہ چھاپی جاتی ہیں۔ سنگ نویسی میں صرف ایک فائدہ ہے اور وہ یہ کہ کام سستا ہوتا ہے۔ ورنہ کوئی اور عیب اس میں ایسا نہیں جو موجود نہ ہو۔ کام میں ازحد دیر ہوتی ہے کتابت بے حد غلط ہوتی ہے اور غلطیوں کو خاطر خواہ صحیح کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ تحریر میں پاکیزگی اور صفائی اور خطوط میں راستی پیدا نہیں ہوتی باہمی فصل غیر مساوی ہوتے ہیں۔ اگر مصنف یا ایڈیٹر دوران طبع میں کوئی عبارت کم و بیش کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔ غرض ایک عجیب بیچارگی اور بے اختیاری کا عالم ہے۔ ٹائپ صرف گراں ہے باقی تمام عیوب سے مبرا ہے۔

لیکن ٹائپ کے رواج دینے میں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سے ٹائپ کو رواج دیا جائے۔ اس کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ رسم الخط کے مسئلہ پر بحث نہ کی جائے۔ جو رسم الخط اس وقت اردو کا ہے وہ عربی ہے جو عرب سے۔ افریقہ اور ایران سے دولتِ عثمانیہ اور ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ جب یہ رسم الخط ابتدا میں ہندوستان آیا تو یہاں بیشتر سنسکرت رسم الخط جاری تھا۔ اور دولت عثمانیہ میں گیا تو وہاں چغتائی کتابت کا رواج تھا۔ مذہب کی قوت اسقدر زبردست ہوتی ہے کہ اس نے مقامی طرز تحریر کو دبا کر عربی کو رائج کر دیا۔ چنانچہ اس وقت تمام دنیا میں سوائے چین کے جہاں چینی اور البانیہ Slav رسم تحریر کا رواج ہے۔ سب مسلمان یہاں تک کہ تاجک و تاتار بھی اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ اب اس رسم الخط کی دنیائے اسلام میں وہی حالت ہے جو لاطینی خط کی فرانس۔ اطالیہ۔ انگلستان۔ المانیہ۔ ہالینڈ۔ رومانیہ۔ فن لینڈ۔ سویڈن۔ ناروے۔ ڈنمارک۔ بلجیئم۔ اسپین۔ پرتگال وغیرہ کے باشندوں کے لئے ہے۔ یہ رسم الخط دنیائے اسلام کے درمیان ایک اتحادی رابطہ ہے۔ ہماری زبان میں بہت سی آوازیں مثلاً بھ۔ پھ۔ تھ۔ ٹ۔ ڈ۔ ڑ وغیرہ ایسی ہیں جو عربی فارسی میں نہیں ہیں۔ لیکن اس کی کمی ہم نے ان حروف سے تلافی کر لی ہے

اور بحالت موجودہ ہم کو اپنا مروجہ رسم الخط بدلنے کی کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ ترکوں نے جن کی اصلی زبان چغتا ہے سخت قباحتوں کے باوجود بھی اسکی متابعت سے انحراف نہیں کیا۔ ترکی زبان میں چینی زبان کی طرح Long Vowels نہیں ہیں اس لئے عربی رسم الخط ان کی ضرورتوں کے قطعی منافی تھا اور ہے۔ ہم کو تو چونکہ ایسی دشواری بھی نہیں اسلئے اسکو چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں۔

رسم الخط پر غور کرنے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لکھنے میں آسانی ہو۔ زیادہ طوالت اور دقت نہ ہو' تاکہ کاغذ اور وقت دونوں میں کفایت رہے۔ اس لحاظ سے بھی ہماری موجودہ طرز تحریر دنیا کی اعلیٰ ترین طرزوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرسکتی ہے حقیقت میں یہ ایک قسم کی مختصر نویسی ہے۔ یہ یقیناً انگریزی کی تحریر سے بہتر و برتر ہے۔ اگر ہم اردو کی ایک عبارت کو انگریزی حروف میں لکھیں تو بلا مبالغہ اس متن سے دو چند سے زیادہ کاغذ اور وقت اور محنت کا صرف ہے۔ اردو پر سب سے زیادہ حق ہندی اور فارسی یا سنسکرت اور عربی کا ہے۔ اس لئے اس کی طرز تحریر بھی انہیں دو قسموں میں سے کسی ایک کی متبع ہونی مناسب ہے۔ لیکن ہندی طرز تحریر میں وہ عیوب نمایاں طور پر موجود ہیں جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس

کے لکھنے میں انگریزی سے بھی زیادہ طوالت اور محنت ہے۔ اس لئے ہم اردو پر ہندی کا حق تسلیم کرنے کے بعد بھی اپنے موجودہ رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی طرزِ تحریر اختیار کرنے کی رائے نہیں دے سکتے اور محض ٹائپ کی سہولت پر اپنی تمام موجودہ خوبیوں اور آسانیوں کو قربان نہیں کرسکتے۔

جس طرح لاطینی اور گاتھک حروف گو متحد النسل ہیں لیکن ان کی کتابت میں ذرا سا فرق ہے۔ اسی طرح عربی اور اردو کتابت میں بھی کچھ اختلاف ہے۔ یہ فرق زبان میں اس ارتقا پر مبنی ہے جو حسن صورت سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح خط کوفی خط نسخ میں بدل گیا ہے۔ اسی طرح خط نسخ محض خوشنویسوں کی جدت طرازی سے تعلیق اور نستعلیق ہوگیا ہے۔ اردو نستعلیق اور عربی نسخ میں فرق صرف اس قدر ہے کہ نسخ خطوط کے اصول اور نستعلیق دوائر کے اصول پر قائم ہے۔ گویا عربی خط کا ماخذ اقلیدسی مربع اور اردو کا دائرہ ہے۔ اب تک یہ کروی (Curve) شکل ہمارے اردو خط کے لئے ایک مزید حسن کا موجب تھی۔ لیکن ٹائپ کے لحاظ سے اس میں بڑا نقص نکل آیا۔ کروی عمدہ خوبصورت ٹائپ بنانے میں مانع ہے۔ اسکی وجہ سے ایک تو جوڑ بہت زیادہ ہوجاتے ہیں جس سے کتابت غلط ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ دوسرے خرچ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں

ایسا ٹائپ بنا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے پاس ایسا ٹائپ موجود ہے۔

اس لئے یہ ایک نہایت غور طلب سوال ہے کہ آیا باوجود ان دقتوں کے اردو نستعلیق ٹائپ کی اجرا کے لئے کوشش کی جائے یا عربی نسخ کتابت کو اختیار کرلیا جائے۔

میری رائے میں اس مسئلہ پر یوں غور کیا جائے۔ ٹائپ ہمارے لئے ایک بالکل نئی شے ہے۔ جب انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ٹائپ اختیار کیا تو ان کی زبانیں بھی دائرہ آمیز صورت میں تحریر ہوتی تھیں۔ انھوں نے قلم کی تحریر سے اپنی کروی کتابت کو قائم رکھا اور ٹائپ کے لئے دوائر خارج کر کے خطوط کو ان کی جگہ قائم کر دیا۔ ہم کو بھی چاہئے کہ اردو کے قلم سے نستعلیق لکھیں اور ٹائپ میں نسخ تحریر کرنے کو رواج دیں۔

آپ یہ کہیں گے کہ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ شروع شروع میں ضرور دقت ہوگی لیکن چند ہی سال میں بالکل جاتی رہے گی۔ ساتھ ہی ہم کو یہ چاہئے کہ تمام اسکولوں اور مدارس سے درخواست کریں کہ وہ اپنی درسیات کو ٹائپ میں تعلیم دینا شروع کریں اور تحریر میں نستعلیق کا استعمال جاری رکھیں۔ ٹائپ کی ایک اور تحریر وہ ہے جس کے بانی مولوی نظام الدین صاحب ہیں۔

یعنی مغربی طرز پر حروف کو بغیر فصل لکھنے کا قاعدہ اختیار کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ٹائپ بہترین ہے اور اس سے سستا ممکن نہیں۔ لیکن اس کے جاری کرنے میں وہ تمام عیوب از سر نو پیدا ہو جاتے ہیں جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور ساتھ ہی ایک حد تک دنیائے اسلام کے اتحاد کا منشاء جو صرف موجودہ رسم الخط سے پیدا ہوتا ہے فوت ہو جاتا ہے۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ تمام دنیائے اسلام میں بعد مشورہ کے اس کو رواج دیا جائے۔ بہر حال یہ تجویز قابل غور ہے۔

اس کے علاوہ میلکم صاحب سفیر برطانیہ متعینہ ایران کی تجویز ہے اور رضا حسن کنتوری اس کے موئید ہیں کہ مذکورہ بالا طریقہ اختیار کیا جائے بالکل حروف سالم نہ لکھے جائیں بلکہ حروف مقطعات میں تحریر ہوں۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ تحریر میں جگہ اتنی زیادہ صرف نہ ہوگی جتنی مولوی نظام الدین کی تجویز پر عامل ہونے سے ہوگی۔ مولوی نظام الدین صاحب کے طرز پر لکھی ہوئی کتابیں بہت زیادہ طویل ہو جایا کریں گی لیکن رضا حسن کنتوری صاحب کی تجویز اختیار کرنے سے ہمارا موجودہ طرز تحریر بالکل ہی بدل جاتا ہے اور اس کا کچھ وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ اور یوں گویا ہم محض ٹائپ کی آسانی کے لئے اپنے اسلاف کرام کی ابتک جانکاہ محنتوں اور

سر توڑ کوششوں کے نتائج کو قربان کر دیتے ہیں کیونکہ اس رسم الخط کے قبول کر لینے سے ہماری تمام موجودہ کتابیں آئندہ نسلوں کے لئے ایسی مشکل اور عجیب ہو جائیں گی جیسے بابل یا مصر کے کتبے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ سنسکرت یا رومن رسم الخط ہی کو اختیار کر لیا جائے جس سے ہم کو کچھ تھوڑا بہت تعلق ہے۔ ایک اور ضرورت ملکی ' قومی اور اسلامی یہ ہے کہ دائرۃ المعارف کی ترتیب دیجائے جو ہندوستان اور اسلام کے متعلق جملہ مضامین پر حاوی ہو۔ یہ برسوں کا کام ہے اور صرف قابل ترین لوگ اسکو سر انجام دے سکتے ہیں۔ ایک دائرۃ المعارف اس وقت انگریزی میں Everyman's library کے نام سے تیار ہو رہی ہے جس کے بانی ہوٹ زما اور شار دے ہیں۔ لیکن ہمارا مطلب اس کے لحاظ سے بیکار اور غیر موزوں ہے۔ ان کتابوں کا عدم ان کے وجود سے بہتر سمجھتا ہوں جن میں تعریف کے پردے میں ہر صفحہ پر اسلام اور ہندوستان کی ہجو ملیح کی جاتی ہے۔ ایک اور ضرورت یہ ہے کہ بہترین موجودہ کتب خانہ کو جو مختلف مضامین سے متعلق ہوں انتخاب کر کے ایک سلسلہ قرار دیا جائے اور Encyclopedia of Islam کی طرح سو کتابوں کا ایک انتخاب شدہ کتب خانہ شائع کیا جائے۔

ایک اور ضرورت یہ ہے کہ اردو ادب کو انگریزی اور دیگر السنۂ ہند مثلاً مرہٹی بنگالی میں ترجمہ کیا جائے اور ملک کے علوم کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ اہل بنگال نے اپنے بہت سے مصنفین کی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ انکی مثال قابل تقلید ہے۔ جب تک یہ نہ ہوگا ہمارے نوجوان اردو کی طرف متوجہ نہ ہوں گے۔ کیونکہ ہماری تہذیب و تعلیم اس قدر پست ہوگئی ہے کہ ہم خودداری کے لئے بھی دوسروں کی ترغیب اور توصیف کے محتاج ہیں۔ دوئم اس علمی دنیا میں نکلنا بھی ضروری ہے جو گھر کی چاردیواری میں مقید نہیں بلکہ اقصائے عالم پر محیط ہے۔ ایک قسم کا تبادلۂ خیالات ہے جو قوموں کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسا افراد کے لئے۔

اب وہ وقت آگیا ہے کہ انجمن ترقی اردو اپنا رسالہ جاری کرے۔ اسوقت ہندوستان میں اردو کے ایک نہایت اعلیٰ پیمانہ کے رسالہ کی از حد ضرورت ہے۔ آج کوئی بھی رسالہ ایسا نہیں جس کو اردو زبان کا نمائندہ کہا جا سکے۔

لیکن یہ جملہ امور اور فی زمانہ علوم کو فروغ دینا کسی ایک فرد یا چند افراد کا کام نہیں ورنہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے اور انکے ہمراہیوں نے کونسا دقیقہ فروگذاشت کیا ہے۔ جب تک یہ کام ایک باقاعدہ جماعت کے

سپرد نہ ہو جس کے اراکین شب و روز ان ہی فکروں میں منہمک رہیں اور جس کے پاس کافی بلکہ وافر سرمایہ ہو، اس کا تکمیل پانا ناممکن ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ شب بیدار مصنف اپنا چراغ جلائے کتابیں لکھا کرتا تھا اب بھی ایسی کتابیں لکھی جاتی ہیں لیکن بالعموم علمی تصانیف کا رنگ بدل گیا ہے۔ جس طرح اقتصادیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ تجارت و حرفت و صنعت میں انقسام محنت سے کام لیا جاتا ہے۔ تصنیف میں بھی اب یہی کیفیت ہے۔

مسٹر مرے نے اپنی طویل عمر کا ایک کثیر حصہ صرف کر دیا اور بیسیوں اشخاص ایک مرتّب محکمہ کی حیثیت سے شب و روز ان کی مدد کرتے رہے تب جا کر مرے ڈکشنری جو ایک جامع لغت ہے تیار ہوئی۔ امیر مینائی کی لغت باب الف سے آگے نہ بڑھنے پائی۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی اور وہ دس سال بھی زندہ رہتے تو (د) دال۔ (ذ) ذال سے آگے نہ بڑھنے پاتے۔

یورپ میں ہر علم کی شاخ پر بہترین کتابیں یوں لکھی جاتی ہیں کہ کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے ایک ایک باب ایک ایک ماہر کے سپرد کر دیا جاتا ہے جن میں سے ہر ایک کو معقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔ جب سب باب مکمل ہو جاتے ہیں تو چند اراکین کی ایک مجلس ان تمام تحریرات کو

قطع و برید کر کے بالآخر ان کو وصل دے دیتی ہے۔ اور چند ہی سال میں کتاب تیار ہو جاتی ہے۔

اگر آپ کسی رصد گاہ میں تحقیقات کے شعبے ملاحظہ کریں تو معلوم ہو گا کہ تیس تیس اور پچاس پچاس حساب دانوں اور مددگاروں کا عملہ ایک عالم کی زیرِ نگرانی حسابات یا اور اندازوں میں شب و روز مصروف ہے۔ قاعدہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ ہر نئے فلکی منظر کے متعلق تمام دنیا کی رصد گاہیں اور تمام منجم اپنی تحقیقات ایک شخص کے سپرد کر دیتے ہیں اور اسکو رصد گاہ اور بہت بڑا عملہ مددگاروں کا دیا جاتا ہے اور پندرہ بیس برس میں نتیجہ کو شائع کرتا ہے۔ لیکن جہاں اہلِ کمال آشفتہ حال پھریں اور جہاں کوئی ایسا ذریعہ نہ ہو جو ان کی کوششوں کو مجتمع کر سکے اِن تمام کاموں میں سے جن کا میں نے شروع سے اب تک ذکر کیا ہے ایک بھی ممکن نہیں۔

جب لوگ اپنی قابلیتوں کا اندازہ لگاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ معمولی محنت سے جس کے لئے دماغی انہماک اور شب و روز کی علمی جد وجہد کی کوئی ضرورت نہیں۔ کثیر دولت پیدا کرنا ملازمتوں اور ٹیوشنوں میں ممکن ہے اور برخلاف اس کے علمی کاوش و کاہش کا نتیجہ غربت کی زندگی اور کسمپرسی ہے تو ان کا خود کو فروخت کرنا کون سی عجب بات ہے۔

یہ تمام نقوش روئے قرطاس سے روئے کار تب ہی آ سکتے ہیں کہ ایک اکادیمیہ Academy کی بنیاد قائم ہو جس میں علماء کی ایک معتد بہ جماعت تفکراتِ دنیا اور مصائبِ معیشت سے آزاد شب و روز کام میں مشغول رہے۔ یہ کام چندوں سے ہونا قطعی ناممکن ہے۔ یہ صرف ایک طریقہ سے امکان میں ہے اور وہ طریقہ وہی ہے جس سے اکادیمیہ فرانس کی بنیاد پڑی تھی یعنی کوئی حکومت اس کی مالی کفیل اور سرپرست ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆

حالؔی

شیکسپیئر کی زندگی کو بلحاظ شاعر اس کے سوانح نگار نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

سب سے اول ہم اس سے کارخانۂ قدرت میں ملتے ہیں۔ یہ زمانہ اس کی شاعری کے آغاز کا ہے۔ اس کے بعد ہم اس کو دنیا میں دیکھتے ہیں جہاں تخیل رازِ ہستی کے اسرار کھول رہا ہے۔ تیسرا زمانہ وہ ہے جب شاعر غم آشنا ہو چکا ہے۔ اب اس نے حسن و عشق کے افسانے یا تاریخ کی پُرشکوہ داستانیں لکھنا ترک کر دی ہیں اور صرف حیات و جذباتِ انسانی کو اپنی بزمِ خیال میں جگہ دی ہے۔ آخری زمانہ میں وہ غم کے بادل جو شاعر کے دل پر چھائے ہوئے تھے ایک ایک کر کے ہٹ گئے ہیں اور اسے معلوم ہو گیا ہے کہ اس عالم پر ایک قانون مسلّط ہے اور اس

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے، گل چیں کا دنیا سے سفر

مولانا حالؔی کی زندگی کے بھی اسی طرح تین دور ہیں۔

پہلا دور

بزمِ غالبؔ میں ہماری مولانا سے پہلے پہل ملاقات ہوتی ہے۔ یہ جوانی کا زمانہ ہے۔ استاد کے اور شاگرد بھی شریک صحبت ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ "عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہیں کیا جاتا۔ بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہیں ہوتی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا ہے۔ اس زمانہ کا کچھ کلام دیوان میں غزلیات کی صورت میں موجود ہے۔ مگر چونکہ صاحبِ کلام کی نگاہ شروع سے ہی نکتہ بیں اور استاد کی طرح طبیعت' بندِ تقلید سے آزاد ہے۔ باوجود طرز قدیم کے اسکی شاعری اور ہمعصر شعراء کے کلام میں ایک خاص فرق ہے۔ محبت شاعری کے لئے ایک پاک جذبہ ہے اور ہر شعر میں وہ جذبہ پنہاں ہے۔ حسن نیکی کا پھول ہے اور گو وہ اس زمین پر پیدا ہوا ہے لیکن اس میں حسنِ ازل کی جھلک موجود ہے۔

بعض نقادانِ سخن نے جو ہمارے ملک میں کلام کا معیار اشعار کے مقابلے کو سمجھتے ہیں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ باوجود مذکورہ بالا خوبی رکھنے کے حالی کا قدیم کلام اس زمانہ کے مشہور شعراء داغؔ اور امیرؔ وغیرہ کے کلام کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا۔ اور حقیقت میں یہ بیان صحت سے خالی نہیں۔ مگر اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ وہ کلام مولانا کی ابتدائی مشق ہے اور

شاعر گو پیغمبر ہوتا ہے۔ اور ماں کے پیٹ سے ہی نبی پیدا ہوتا ہے مگر ملکہ نبوت کو ترقی دینے اور کمال حاصل کرنے کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔

مگر بزمِ غالب ابھی جمنے بھی نہ پائی تھی کہ محفل برہم ہوگئی۔

در محفلے کہ یاراں شربِ مدام کردند
چوں نوبتے بما شد آتش بجام کردند

اور مولانا حالیؔ مایوس ہو کر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی بزمِ شعرا میں شعرخوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

دوسرا دور

وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو کام قلم سے لینا تھا وہ لیا جا چکا۔ مگر ہندوستان پر ایک انقلابِ عظیم آ رہا تھا جس میں انہیں معتدبہ حصہ لینا تھا۔ مسلمان بادشاہوں کی عیاشی اور آرام طلبی اور قابل حق داروں کی آمد نے پہلے ہی اہل ہوش پر ثابت کر دیا تھا کہ اسلام ہندوستان میں ہو چکا۔ مگر غدر تک عوام کی آنکھیں بند تھیں اور لوگ ذلت و جہالت۔ مکر و فریب کی نقاب سے چہرے کو اس قدر لپیٹے ہوئے تھے کہ برا بھلا سمجھنے کی کوئی تمیز نہ رہی تھی۔ جب غدر نے ہاتھ پکڑ کر ایوان شاہی سے باہر لا کر طوفان میں کھڑا کر دیا۔ اس وقت معلوم

ہوا کہ ہم کس حالت پر پہنچ گئے ہیں۔ بھیڑوں کی طرح جن کا کوئی چوپان نہ ہوا ایک دوسرے کا منہ دیکھتے تھے اور بے راہ ادھر اُدھر پھرتے تھے۔ ایسے میں جب بچنے کی کوئی امید نہ تھی سرسید مرحوم اس شبِ ظلمت میں روشن ستارے کی طرح چمکے اور ترقی کا راستہ نمودار ہوا۔ سپہ سالار کے حکم سے افواجِ اسلام اس شاہراہ پر بڑ لیں اور مولانا بحیثیت نقیب ان کے ہمراہ ہوئے۔ مگر جو مہم سر کرنی تھی وہ کوئی قدیم الایام کی لڑائی نہ تھی جس میں ان کو رجز خوانی سے ہمراہیوں کا دل بڑھانا ہوتا بلکہ وہ تنازع للبقاء میں مسلمانوں کی آخری کوشش تھی جس کی نسبت ان کو کہہ دیا گیا تھا کہ اب کے شکست ہی شکست ہے۔ اس میں لوگوں کو جوش دلا کر توپ و تفنگ کے مقابلہ میں نہ لیجانا تھا جو کہ ایک نہایت آسان کام ہے بلکہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اس لڑائی کے لئے تیار کرنا اور ابھارنا مقصود تھا جس میں قلم تلوار پر غالب ہے۔

مسدس مدّ و جزرِ اسلام۔ چند نظمیں اور جدید غزلیات اس زمانہ کے افکار کا نتیجہ ہیں۔ مسدس نئی شاعری کا بنیادی پتھر ہے اور اس میں سخنور نے ایک ایسا نمونہ شاعری کا پیش کیا ہے جس کی مثال اب تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہورِ اسلام سے پہلے تھی اور جس کا

نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکبِ اسلام کا طلوع ہونا اور نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتہً سرسبز اور شاداب ہوجانا اور ابرِ رحمت کا امّت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی اور دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لئے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آکر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔ مدّ و جزر اسلام کے تاریخی واقعات اس صحت اور خوبی کے ساتھ نظم کرنا مولانا حالؔی کا ہی حصہ ہے۔ اس کے مختلف حصے ایسے باربط اور مرتب ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے۔ نظم لکھنے میں خیال کو ایک ہی واقعہ پر جمائے رکھنا اور اس واقعہ کا ایک ایسی تاریخ سے اخذ کرنا جو نصف دنیا اور ایک ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے متعلق ہے کوئی آسان امر نہیں ہے۔

ہم سب ناقص انسان ہیں اور وہ ایک کامل فرد ہے جس کی نگاہ مشرق سے مغرب تک دیکھ سکتی ہے۔ وہ تذکرۃ الاولین اور سیر المتأخرین دونوں سے واقف ہے۔ وہ صرف موجودہ پستی کا نقشہ ہی نہیں کھینچتا بلکہ اس کے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہے۔ اسکی تقریر میں رعد کی کڑک اور اس کے کلام میں قانون کا اثر ہے۔ اس کی ایک آواز نے راس کماری سے لے کر

دامن ہمالیہ تک کے مسلمانوں کو بیدار کردیا۔ پست اپنی پستی سے واقف ہوگئے مغرور اپنے غرور پر نادم ہوئے اور جاہل اپنی جہالت سے شرمائے۔ اس نے مردہ دلوں میں احساس کا شرارہ پیدا کیا۔ اس سے زیادہ کلام کا اور کیا اثر ہوسکتا ہے؟ چونکہ اس کے کلام میں سچ اور درد تھا (درد پھیلا اور سچ چمکا) سرسید مرحوم جو زبان اردو کے مجدد ہیں فرماتے ہیں کہ اگر خدا نے قیامت کے دن مجھ سے سوال کیا کہ کیا لایا ہے تو عرض کروں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں۔

اس کے بعد ہم مولانا کے (مجموعہ نظم حالی) پر غور کرتے ہیں۔ اس میں سے برکھارُت۔ نشاطِ امید۔ حب وطن۔ مناظرۂ رحم و انصاف۔ جوانمردی کے کام وغیرہ نظمیں ہندوستان کی اکثر درسی کتابوں میں شامل ہیں اور بچے سعدی پانی پتی کے اس کلام کو اسی دلچسپی سے پڑھتے ہیں جیسے حکایاتِ گلستان کو مدرسۃ العلوم کے بچے۔ مدرسۃ العلوم مسلمانان اور تعلیم مسلمانان وغیرہ قومی نظمیں ہیں۔ اور ''جشنِ جوبلی'' اور ''دربار قیصری'' کو قصائد مدحیہ کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں۔ ان تمام نظموں کی سب سے بڑی خوبی بیان اور زبان کی سادگی ہے۔ اور چونکہ ان میں سادہ کہانیاں اور واقعات نظم ہیں سادگی ان کے لئے نہایت موزوں ہے۔ دوسری خوبی

اختصار کی ہے۔کم یا زائد از ضرورت باتیں نہیں بیان کی گئیں۔ترتیب کے لحاظ سے بھی کوئی عیب ان میں نہیں نکالا جاسکتا مگر نظم کی تکمیل کے لئے اس کے علاوہ بھی چند چیزوں کی ضرورت ہے۔اول الفاظ کا انتخاب۔دوم الفاظ کی تعداد۔سوم الفاظ کی ترتیب۔الفاظ کا انتخاب عموماً نہایت موزوں ہے۔ الّا چند حروف کے استعمال سے کہ جن پر بعض اہل دہلی اور عموماً نقادان لکھنؤ معترض ہیں۔اور واقعی جب تک خاص زبانِ اردو میں کسی چیز کے لئے موزوں لفظ موجود ہو دوسری زبان سے مدد لینا نامناسب اور غیر ضروری ہے۔مگر اتنا کہہ دینا کافی نہیں۔اس استعمال کی ایک وجہ یہ ہے جس طرح سرسید احمد خان مرحوم نے زبان کی نثر سے دقیق۔مشکل۔مرصع اور دوراز فہم الفاظ کو خارج کر دیا ہے۔اور بہ تقاضائے وقت سلیس عبارت کو رواج دیا ہے ویسے ہی مولانا نے نظم کو موجودہ خیالات کے ساتھ مطابقت دینے کے لئے سادہ بنانے کی کوشش کی ہے اور گو طرز کو بدلنے میں دونوں کامیاب ہوئے ہیں مگر سرسید اس کام کو بے عیب پورا کر گئے ہیں اور مولانا افراط وتفریط کی غلطی میں بھی پڑ گئے ہیں۔حقیقت میں یہ سوال وقت سے متعلق ہے اور وقت ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔

الفاظ کی تعداد کی نسبت بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کو ان

کے استعمال پر خوب قدرت حاصل ہے اور اگر نقادانِ سخن کی رائے سے نامناسب ہندی اور تمام انگریزی الفاظ کو خارج بھی کر دیا جائے تو بھی مولانا اگر شیکسپیئر نہیں تو اردو کے ملٹن ضرور ہیں۔ ترتیب الفاظ نہایت موزوں اور عیب سے پاک ہے۔

''بیوہ کی مناجات'' البتہ ایک ایسی نظم ہے جس میں ہندی الفاظ استعمال ہونے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

ایک نہایت نازک خیال نقاد نے مولانا کے کلام پر اعتراض کیا ہے کہ وہ (Unnatural) خلاف فطرت ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

''اے شبِ ماہتاب تاروں بھری''

اور خود بقول مولانا ''شعر کے نیچر (Nature) کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں''۔

واقعی یہ اعتراض صحیح ہے۔ مگر ہماری رائے میں اول تو ایسی غلطیوں کی مثالیں بہت ہی کم دکھائی جاسکتی ہیں۔ اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ غور نہیں کیا۔ اتفاقاً غلطی ہوگئی ہے۔ اور اگر اس سے رفعِ اعتراض نہ ہو تو کہا جائیگا کہ مولانا نے نیچر کا مطالعہ ''برگِ درختاں'' سے نہیں کیا۔ بلکہ ''اوراقِ کتب'' سے کیا

ہے۔ اور اسی لئے ایسی غلطی کر گئے ہیں۔ چنانچہ ملٹن بھی اپنے کلام میں چنڈول اور سرخ چڑیا میں تمیز نہ کر سکا تھا۔ ان کا کلام آمد نہیں بلکہ آورد ہے۔

اس کے بعد "شکوۂ ہند" اور چند نظمیں ہیں جو مختلف کانفرنسوں کے موقعوں پر پڑھی گئی ہیں۔ شکوۂ ہند کو مسدس سے دوسرے درجہ پر مانا گیا ہے اور واقعی زوالِ اسلام کی تصویر جو اس میں کھینچی گئی ہے نہایت عبرت خیز اور رلانے والی ہے۔ گویا شاعر نے اپنا دل ہمارے سامنے رکھدیا ہے اور نظمیں بھی بحیثیت خود مکمل اور قابل تعریف ہیں۔

تیسرا دور

۱۸۹۸ء میں مولانا کی زندگی کا دوسرا دور بھی ختم ہو جاتا ہے یعنی سرسید مرحوم کا انتقال ہو گیا اور وہ کئی حیثیتوں سے دنیا سے کنارہ کش ہو گئے۔ گو سرسید مر گئے تھے ان کا کام باقی تھا اور اس کا بار امانت قوم پر عموماً اور ان کے دوستوں پر خصوصاً تھا۔ اس لئے مولانا نے دنیاوی خوشیوں کو گو ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا مگر اس کام میں شریک رہے۔ اور اب تک شریک ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک فارسی مرثیہ مرحوم کی وفات پر لکھا۔

یہاں پر ہم بحیثیت مرثیہ گو مولانا کے کلام کا موازنہ نہ کریں گے اور صرف دو مرثیوں پر غور کریں گے۔ پہلا غالب کا مرثیہ۔ دوسرا سرسید کا

مرثیہ۔ پہلا زبان اردو اور دوسرا بزبان فارسی۔ غالب کا مرثیہ تعلقات شخصی کے منقطع ہونے کی ایک دردانگیز تصویر ہے۔ اور ٹینیسن (Tennyson) کے اِن میموریم (In Memoriam) کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید کا مرثیہ قومی ماتم کا دردناک بیان ہے۔ جس میں نالہ وبکا کی آواز ہر شہر و دیار کو اٹھائے ہوئے ہے۔ اور وہ قدیم زبان کی ان تقریروں سے مشابہ ہے جو بڑے آدمیوں کے جنازوں پر تدفین سے پہلے کی جاتی تھیں۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے مرثیوں کی مثال ہماری زبان میں نہیں ہے۔

اس کے بعد تحفۃ الاخوان۔ اور چپ کی داد۔ دو نظمیں خصوصاً قابل تذکرہ ہیں۔ گو بہ تقاضائے وقت پہلا سا جوش ان میں نہیں پایا جاتا اور نہ ویسی شاعری ہی ان میں موجود ہے مگر ایک خاص حیثیت سے وہ بہت ممتاز ہیں انکو پڑھ کر انجیل کے وہ مقامات یاد آجاتے ہیں جہاں حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کے سامنے وعظ فرمارہے ہیں۔ اور مجھے اس بات کے کہنے میں دریغ نہیں کہ شاعر اس زمانہ میں پورا پیغمبر معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور لحاظ سے بھی اس زمانہ کا کلام خصوصیت رکھتا ہے یعنی مسلسل شعر اس وقت کے کلام میں بہت پائے جاتے ہیں۔ جو ظاہر کرتے ہیں کہ مولانا کو کلام پر کس قدر قدرت حاصل ہے۔

مگر سب سے بڑی بات جو حالی میں موجود ہے اور کسی میں نہیں یہ ہے کہ ان کا کام اور کلام ایک ہے۔ ان کا کلام ان کی زندگی کا مرقع ہے۔ الطاف حسین اور حالی انسان اور شاعر ان میں علیحدہ علیحدہ نہیں۔ گویا وہ خود اپنے سوانح نگار ہیں۔ اس لئے جو ان سے واقف ہونا چاہے ان کا کلام پڑھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مثنویاتِ اقبالؔ

اسرار و رموز

علامہ عبدالرحمٰن بجنوری پی۔ ایچ۔ ڈی کے فاضلانہ مضمون کا ترجمہ

(از جناب مالک رام صاحب ایم۔اے)

بیس برس گذرے علامہ اقبالؔ کی زندگی ہی میں ''نیرنگِ خیال'' (لاہور) کو ''اقبال نمبر'' شائع کرنے کی اوّلیت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مثنویاتِ اقبالؔ کے متعلق ڈاکٹر بجنوری کا فاضلانہ انگریزی مضمون جس کا ترجمہ مالک رام صاحب نے کیا تھا اور جو اس وقت بھی ایک نادر تحریر کی حیثیت رکھتا تھا، اب اور زیادہ نایاب ہو گیا ہے۔ یہ ترجمہ جس کے ساتھ مالک رام صاحب کے حواشی بھی شامل ہیں اسی اوّلیں ''اقبال نمبر'' کی ''فتوح'' میں سے ہے۔ ہم نے اسے بالکل جوں کا توں شائع کیا ہے اور بجز کتابتِ اشعار کی تصحیح کے اس وقت کی دیگر اغلاطِ کتابت میں بھی کسی قسم کی مداخلت گوارا نہیں کی۔ ''الحمرا''

''جن لوگوں نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا دیباچہ دیوانِ غالبؔ (نسخۂ حمیدیہ) جو علیحدہ کتابی صورت میں بھی بعنوان ''محاسنِ کلامِ غالبؔ'' چھپ چکا ہے، پڑھا ہے وہ اس سے موصوف کے

عمقِ فکر اور پہنائی خیال کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جن سے علم و ادبِ اردو کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ بد قسمتی سے اجل نے انہیں فرصت نہ دی کہ وہ کچھ مستقل خدمتِ زبان کر سکتے۔ انہوں نے سوائے چند مضامین کے کوئی اپنی زیادہ پائدار یادگار نہیں چھوڑی۔ مگر جو تھوڑا بہت بھی ان کے قلم سے نکلا ہے کافی ہے کہ ہم اس سے ان کے وسعتِ مطالعہ، دقتِ نظر اور اصابتِ رائے کی نسبت ایک صحیح رائے قائم کر سکیں۔

ایک برخود غلط ادیب کی رائے میں دیباچۂ مذکور میں ''سوائے شرح اشعار کے اور جو کچھ ہے سب واہی تباہی ہے''۔ یہ رائے اردو کے ایک شاہکار مضمون کی نسبت ہے اور ہر شخص کا حق ہے کہ وہ کسی چیز کی نسبت جو رائے چاہے قائم کرے۔ مگر کیا اچھا ہو کہ تنقید اور رائے قائم کرنے سے پہلے جذبۂ تنقیص و تفضیح دل سے نکال دیا جائے۔ پندار اور تفاخر کوئی اچھی چیز نہیں اور جب کسی نقاد کے دل میں یہ چیزیں راہ پکڑ لیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ راہِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے اور روا روی میں ایسے خیالات کا اظہار کر جاتا ہے جو کسی دوسری حالت میں غالباً وہ زبان پر نہ لائے گا۔

اگر ادیبِ ممدوح نے ذرا یہ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی کہ مضمون لکھتے وقت ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی نفسیاتی کیفیت کیا تھی تو شاید وہ اس فیصلے پر نہ

پہنچتے۔ میرے نزدیک اس مضمون میں جو والہانہ جوش دکھایا گیا ہے اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول، غالبؔ سے پہلے اردو زبان کا جو سرمایہ تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یہ ایسا پامال اور فرسودہ مضمون ہو چکا ہے کہ اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ غالبؔ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہمیں یہ بتایا کہ اردو زبان میں ترقی کی کتنی صلاحیت ہے۔ اس میں وسعت کی کتنی گنجائش ہے اور اس میں کیسے کیسے خیالاتِ جدید اور مضامینِ عالیہ کا اظہار ممکن ہے۔ بجنوری مرحوم کے پیشِ نظر غالبؔ بھی تھا اور اس کے پیشرو معاصرین بھی۔ انہیں حیرت ہوئی کہ اس آذرکدے میں یہ ابراہیم پیدا کیونکر ہوا؟ جواب ایک ہی تھا، جوہرِ صالح اور ذہانتِ خداداد۔ اس امر نے ان کے دل پر غالبؔ کے تفوق کو منقوش کر دیا اور اس کے ساتھ ہی قدرتی طور پر کچھ خوش اعتقادی کا شائبہ بھی پیدا ہو گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مضمون میں مرحوم نے آئینۂ غالبؔ میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اپنا تخیل اتنا بلند اور علم اتنا وسیع تھا کہ لکھنے تو وہ رہے تھے دیوانِ غالبؔ پر تبصرہ لیکن جا بجا اپنی روح اور دماغ کے نقوش کی تعبیر دیوانِ غالبؔ سے ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے مرغوبات کو غالبؔ پر چسپاں کر دیا۔ لازماً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مضمون زیرِ بحث

میں ایسے مبحث بھی آ گئے جو نفسِ مضمون سے بے تعلق معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ واہی تباہی ہے۔ یقیناً اس میں بھی اتنا سامانِ بصیرت موجود ہے کہ ہم اس سے غالب کی دھندلی تصویروں کو زیادہ اجاگر کر سکتے ہیں۔ اور غیر ممالک کے مصنفین کے ساتھ موازنہ کر کے ایک رائے (خواہ وہ کتنی ہی غیر مکمل کیوں نہ ہو) قائم کر سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل مضمون بھی ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ اسرارِ خودی سب سے اول بار ۱۹۱۶ء میں اور رموزِ بیخودی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ مرحوم نے جب ہی یہ مضمون انگریزی رسالہ ''ایسٹ اینڈ ویسٹ'' میں لکھا تھا۔ جب ایک زبان کے خیالات دوسری زبان میں منتقل کئے جائیں تو وہ اپنی شگفتگی اور چستی کا اکثر حصہ کھو بیٹھتے ہیں۔ اس وجہ سے جیسا کہ ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے۔ میں نے لفظی ترجمہ سے احتراز کیا ہے مگر کہیں بھی اصل مضمون کی روح کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ نوٹ سارے کے سارے میں نے خود بڑھائے ہیں اور کوشش کی ہے کہ متعلقہ اشعار درج کر دئے جائیں لیکن پھر بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مضمون پر کے تمام اشعار دے دئے گئے ہیں۔ مثنویوں میں ایک ایک موضوع پر طرح طرح سے بحث کی گئی ہے۔ جگہ جگہ نئے نئے انداز سے

اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر تمام متعلقہ اشعار درج کرتا تو بلا مبالغہ دونوں مثنویاں ساتھ چھپ جاتیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ناظرین اسرار و رموز کا خود غائر مطالعہ کریں اور ان کے مضامین کو سمجھنے کی سعی کریں۔

فقط مالک رام۔

(مالک رام صاحب نے جو حاشئے تحریر کئے ہیں ان کو ہم نے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شائع کیا ہے۔)

"جب نقد و تبصرہ کا موضوع کوئی زندہ مصنف ہو تو نقاد کے لئے لازم ہے کہ قدم پھونک پھونک کر اٹھائے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ مصنف اور نقاد کے درمیان کوئی رنگین پردہ حائل ہو جائے یا قربِ مکانی ہی مصنف کے خدوخال کی تفاصیل کو دھندلا کر دے۔

ہندوستان کے اسلامی ادب میں روح کا 'ملاءِ اعلیٰ' کی جانب صعود مرزا غالبؔ کے زمانے سے بدستور جاری ہے۔ غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ ایک مقدس اقانیم ثلاثہ کے ارکان ہیں۔ غالبؔ نے اس سکون و جمود کا خاتمہ کر دیا جو انحطاط کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کر دیئے مگر وہ کوئی غیر معقول مشکک نہیں تھا جسے اپنے شک کی صحت پر بھی یقین نہ ہو۔ اس کا شک ایک چنگاری تھی جس

نے دنیا میں آگ سی لگا دی۔ دہلی کی سلطنت اس کی شاعری کی متحمل نہ ہو سکی اور اس کی ایک نگاہ نے اسے ملیامیٹ کر دیا۔

حالیؔ نے جس کے خون میں شعرائے عرب کی سی گرمی تھی دیکھا کہ دنیا اپنی ظاہری حسن و نمائش کے باوجود تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اس نظارہ نے اسے بہت متاثر کیا مگر اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کی۔ اس نے غم و یاس کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوت کی مسرت کا احساس کیا اور اپنے استاد کی تاخت کردہ عمارت کے کھنڈرات پر ایک نئی دنیا کی تعمیر اٹھائی اور اسے اپنے سینے میں نشو و نما دی۔ امید کی جھلک نے اسے نئی زندگی دی اور یوں تن مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔

اقبالؔ کی شاعری اب یاس و قنوط کی زنجیروں سے آزاد ہو گئی ہے۔ اُس نے اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اور نئی عمارت کو متفاوئی بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ اس کا نام وعدہ اور بشارت کا مترادف ہے۔ اس نے زمانۂ حاضرہ کے غیر ملکی اثر پر قابو پا لیا ہے جو فضائے ہند پر چھایا جا رہا تھا اور یہ سب کچھ اس نے اخلاقی قوت کی مدد سے کیا ہے جس کا منبع اور مبدأ خالص اسلامی ہے۔ اس کی روحانی تعلیم نے اس انانیت کو فتح کر لیا ہے جو اس مادی دور کی پیداوار ہے۔ اقبالؔ اسلامی کارواں کا سالار ہے۔ جس کی

منزلِ مقصود حرم محترم ہے۔

اقبال کے ساتھ ادب نوجوانوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور خود ہی جوان ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت اس کی دونوں مثنویوں (اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی) سے پوری طرح نمایاں ہے۔ ان میں وہ زندگی ہے وہ طاقت ہے جس کے لئے ہماری نئی نسل پرانے غزل گو شعراء کے دواوین کو بے سود کھنگالتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر باک نہیں کہ اقبال ہمارے درمیان مسیحا بن کر آیا ہے جس نے مُردوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دئے ہیں۔ زمانے پر اس کے پیغام کی اہمیت رفتہ رفتہ واضح ہوگی جو عہدِ حاضرہ کی ان دونوں معرکۃ الآرا نظموں میں پنہاں ہے۔

مثنویاں ایک ایسے غیر فانی کام کا جزو ہیں جو تکمیل کے بعد اسلامی دنیا کے خواب کی صحیح تعبیر ہوگا۔ اقبال کے نظریہ کے مطابق موجودہ اسلامی ممالک کے تنزل کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے عمل کی زندگی کی بجائے افلاطونی بے عملی کو اختیار کر لیا ہے۔ افلاطونیتِ جدیدہ اور حافظ نے ان سے وہ احساسِ مسرت چھین لیا ہے جو ''کچھ کر لو'' کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اور اس کی جگہ اُس دماغی تعیش نے لے لی ہے جو ایک تنِ بیمار کا خاصہ ہے۔ مسلمانوں میں سنگِ خارا کی سختی کی بجائے کوئلہ کی سی نرمی آ گئی ہے۔ خوفِ

خدا کی جگہ مخلوقِ خدا کا خوف ان پر حاوی ہو گیا ہے(۱) مگر زندگی کا ایک نصب العین بنانے سے سب خوف دور ہو جاتے ہیں۔ترقی وعروج،اسلام کے لئے خدانے ودیعت کر رکھے ہیں۔پس توحید الٰہی پر کامل اعتقاد ہمیشہ خوف کو زائل کرتا ہے(۲) اور دل میں وہ عزمِ صمیم پیدا کرتا ہے جو خلاقی کا طغریٰ ہے۔حکایتِ شیر و شہنشاہِ عالمگیر(۳) اندروقلس (Androcles) اور شیر کی کہانی نہیں ہے(۴)

اسلام کی روح مساوات کی روح ہے۔بانیانِ سلطنت کا خون بانیانِ مکاناتِ آب وگل سے زیادہ قیمتی نہیں۔شریعت کے معتوب کے لئے کوئی پناہ نہیں اور جس کا محافظ قرآنِ کریم ہے اسے خوف سے کوئی واسطہ نہیں(۵)

اقبالؔ ایک محدود زمانے کے اندر اسلامی نظام کو ازسرِ نو حیاتِ تازہ اور شباب بخشنے کا دعویٰ کرتا ہے بعینہٖ جس طرح ایک مہوّس مادہ خام سے سونا نکال لیتا ہے۔وہ موجودہ زمانے کا ہے مگر اس کی نظر مستقبل پر بھی ہے اور موجودہ زمانے کا نکتہ چیں بھی ہے۔

ایمرسن(۶) افلاطون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہملٹ بالکل افلاطونی ہے۔اقبالؔ اپنے ہم مذہبوں کو افلاطون کے ہملٹ پن

(تساہل پسندی) کے خلاف خبردار کرتا ہے۔ اس تساہل پسندی اور اخلاقی ضعف نے کئی قوموں کو بلندی سے دے پٹکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان اس زمین پر رہیں اور یہاں کے 'کار' کی نکوکاری پر توجہ دیں۔ افلاطون اس پرندۂ صبح کی مانند ہے جو ایک اثیری دنیائے خواب وخیال میں پرواز پر قانع ہے۔ برخلاف اس کے اقبال ایک بحری عقاب کی طرح ہے جو بحرِ حیات کی طوفان خیز موجوں پر سوار ہو۔ اقبال کا فلسفہ خودی عمل کا فلسفہ ہے۔

اقبال کو سب سے بڑا اعتراض اس یونانی فلسفی کے مسئلۂ اعیان (۷) پر ہے جسے جدید افلاطونیوں نے مرتب کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ 'افلاطونیت جدید' پر بدترین ضعف طاری ہے اور وہ ضعف فقدانِ جذبۂ عمل سے ہے۔ ان کا مابعد الطبیعات قاطعِ حیات ہے اور مقصدِ زندگی کا محو کنندہ۔ کیا یہ تباہی کا راستہ نہیں؟ اقبال کے نزدیک زندگی ایک حقیقت ہے۔ اسلامی زندگی سے بڑھ کر اور کوئی معراج نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "تحقیق میں زمین پر ایک نائب قائم کرنے والا ہوں" (۸)

اقبال میں جان ہے، چستی ہے، خلاقی ہے، قناعت ہے، تفاؤل ہے، خونِ تازہ ہے، حقیقت پژوہی ہے، اور سب سے بڑھ کر اسلام ہے۔ وہ نہیں دیکھ سکتا کہ ملّت ابراہیمی دار الفنا میں داخل ہو۔ خواہ اس کا راستہ

دکھلانے والا خود افلاطونِ اعظم ہی کیوں نہ ہو۔مسلمانوں کی قناد گی ،اور گوسفندی اسے غضبناک کر دیتی ہے وہ اسے روحانیات اور تصوّفِ جدید پر محمول کرتا ہے۔ یہاں وہ ایک مبارز کی حیثیت میں کھڑا ہو جاتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کامدِ مقابل کون ہے؟ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں۔ وہ حافظِ شیراز ہے۔ اقبالؔ کا قلم تلوار سے کم کاٹ نہیں کرتا۔ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ یہ روحانیات یا تصوفِ بُعد کی پیداوار ہے اور ہمارے مذہب کی روح کے منافی ہے۔ اسلام کا اساسی اصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد 'ہمہ اوست' پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے اور 'ہمہ اوست' منفی۔ ہارٹن کا خیال ہے کہ تصوفِ جدید بہت حد تک زرتشتی اور بدھ مت کے خیالات سے متاثر ہے۔ فان کریمراس میں ویدانت کے آثار دیکھتا ہے لیکن میرے خیال میں صداقت افلاطونیتِ جدید اور آزادنشو وارتقاء کے بین بین ہے۔

تصوف کے رویتِ حق اور افلاطون کے اعیانِ نامشہود میں مماثلت ہے۔ صوفیوں کا رقصِ مستانہ درحقیقت نقل ہے افلاطونی روح کی جو ایک متحرک دائرہ ہے اپنے مرکزِ قدیم کے گرد اور بس، اور یہ مرکز خود خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔ افلاطونیتِ جدید اور تصوف جدیدہ دونوں کی تفاصیل اور ظواہر میں بہت حد تک تطابق موجود ہے۔ براؤن لکھتا ہے کہ

فلاطینوس (۹) کی تحریرات صاحب الفہرست (۱۰) اور شہرستانی (۱۱) سے مخفی نہیں تھیں۔

اسلام ان تمام بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ خدا ربّ العالمین ہے اور مادّہ کی علت سے مبرا۔ اس کی تخلوق سراب نہیں۔ جس طرح خدا پتھر اور لکڑی سے تراشا نہیں جاسکتا اسی طرح اس کی رویت ظاہر بھی مادی یا روحانی آنکھوں سے ناممکن ہے۔ شیخ احمد سرہندی (۱۲) اپنے ملفوظات میں بیان فرماتے ہیں: ''اگر کوئی صوفی یا مجذوب خیال کرتا ہے کہ اس نے خدا کا دیدار کیا ہے۔ چشمِ ظاہر سے یا چشمِ باطن سے تو اس نے اپنے واہمہ یا اپنے دماغ کی مصوّر شکل کے سوا کچھ نہیں دیکھا'' خداوند تعالیٰ بے مثال ہے، یکتا ہے اور نظر سے اوجھل۔ خدا تک پہنچنے کا راستہ شریعت کا راستہ ہے (۱۳) جدید تصوف کے خیالاتِ باطلہ مغضوب اور ضالین کے راستے پر چلاتے ہیں اقبالؔ کے فلسفہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اسلامی عقائد و شعائر کو افلاطون اور ارسطو کے تاثرات سے آزاد کردے۔ تاثرات جن کا لازمی نتیجہ رہبانیت و تباہی ہے۔ تصوف جدید رہبانیت ہے۔ اس دنیا کو خواب در خواب مایا یقین کرتا ہے۔ یہ زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنے سے کتراتا ہے اس نے اسلام کی تعلیمِ عمل کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور عمل ہی اصلِ اسلام

ہے(۱۴) اقبالؔ اپنے ہم مذہبوں کو پھر اسی عمل کی طرف واپس بلاتا ہے۔ اس کی حقیقی روحانی تعلیم اخلاقی قوت، جوش، فکر، سرگرمی اور عمل میں مضمر ہے۔ مگر وہ حافظؔ سے کیوں برسرِ پیکار ہے؟ اور مولانا جلال الدین رومیؔ کے خلاف صف آرا نہیں ہوتا۔ حالانکہ مؤخر الذکر تمام متصوفیانہ شاعری کا باوا آدم ہے۔ سبب ظاہر ہے۔ صوفی جب اپنے تجربات بیان کرتے ہیں تو انہیں قدرۃً ایسے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں جو عوام کے فہم و ادراک کے مطابق ہوں۔ خیالات خواہ آسمانی ہی کیوں نہ ہوں مگر ذریعہ اظہارِ خیالات زمینی الفاظ ہوں گے۔ عشق جب 'مے' اور 'نغمہ' کے پردوں میں بیان کیا جائے گا تو عجب نہیں کہ اس سے مادّی اور ہیجانی لذات مراد لی جائیں۔ سنائیؔ، عطارؔ اور رومیؔ باوجود اس کے ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو ان کی حقیقی روح کو صاف نمایاں کر دیتی ہے اور ان کی نظموں کو مادّی تاویل کے جال میں نہیں پھنسنے دیتی۔ ممکن ہے وہ اپنے ناظرین کو دنیا سے پرے لے جائیں مگر وہ اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے۔ برخلاف اس کے حافظؔ نے ان کے نشہ آور جرعہ میں اصلی شراب ٹپکا دی ہے۔ اس کا دیوان بصیرت سے زیادہ سُکر آور ہے۔ بلاریب سقراط (۱۵) کی مانند حافظؔ مخربِ اخلاق نہیں۔ تاہم وہ ان کے خراب کرنے میں ممدّ و معاون ضرور ہوا ہے۔ اس

سے بہتوں نے شرابِ حقیقت کی بجائے شرابِ مجازپی ہے۔اقبالؔ کا حملہ در اصل اس اپیکوری رَو(۱٦) کے خلاف ہے نہ کہ شعرا کے مادّی تصوفِ جدیدہ پر۔

جیسا کہ نکلسن دیوانِ شمس تبریز کے دیباچہ میں لکھتا ہے:''تصوفِ جدیدکے انحطاط کی انتہا یہ ہے کہ اس نے پیر کو الوہیتی صفات سے متصف کر دیا ہے۔پیر کے سبّ وشتم اور بد اخلاقیوں بلکہ اس کے جرائم کی نہ صرف یہ کہ تاویل کی جاتی ہے بلکہ ان کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔۔۔۔ایسے نظریوں کا جو برا اثر سادہ لوحوں پر پڑتا ہے اس کے نتائج سے کون آگاہ نہیں''۔یہ دوسری وجہ ہے اقبالؔ اور آج کل کے صوفیوں کے درمیان جنگ کی۔جب اسرارِخودی شائع ہوئی تو بعض صوفی پیر جنہیں روایاتِ باطلہ کی پابندی اور شریعتِ حقّہ سے ناواقفیت کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا(۱۷)اقبالؔ کے خلاف کھڑے ہوگئے۔''اسے دار پر کھینچ دو۔یہ مسلمانوں کو مغربی مادیت کی تعلیم دیتا ہے۔''اقبالؔ کی آواز شوروشغب سے بلند سنائی دی۔''جاہل اور برخود غلط!خدا کی شان کہ آج افلاطونی اور ہمہ اوستی مجھے مغربی مادیت کا شائع کرنے والا خیال کررہے ہیں۔''

آج ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے اہم ترین سوال

مسئلۂ وطنیت ہے۔اسلام قیدِ مکانی سے آزاد ہے اور وطنیت بستۂ حدود و جہات ہے۔اقبالؔ بھی اپنے آپ کو اسلام اور وطن کے درمیان گھرا ہوا پاتا ہے۔اس کی شاعری ان خیالات کی تصویر ہے جو آج ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں گزر رہے ہیں۔وہ میکیاولی (۱۸) کو مجرم گردانتا ہے اور اسے ''مقامی ریاست'' کے خیال کا بانی قرار دیتا ہے۔اقبالؔ اس فلارنسوی (فلارنس کا رہنے والا) کو موردِ طعن ٹھہراتا ہے جس نے دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔اس لئے نہیں کہ اس کی ''کتاب الملوک'' شاہنشاہوں کا لائحۂ عمل بنی بلکہ اس لئے کہ اس کی تعلیم دانتے (۱۹) اور مارسیلیس کے ''ریاست عالمگیر'' کے خیال کو زائل کرنے اور عیسائیت روما کو حدودِ اطالیہ میں قیام کروانے پر منتج ہوئی۔اقبالؔ نہیں چاہتا کہ اسلام ملکوں کی چہار دیواری میں قید ہو کر لخت لخت ہو جائے۔اقبالؔ کی سیاست اخوت پر مبنی ہے نہ کہ خود غرضی پر، مذہب سیاسی زندگی کا حقیقی پاسبان ہے۔وطن یا ملک ایک عارضی اور جغرافیائی چیز ہے۔تاریخی حوادث اور واقعات اس کے حدود اور نصب العین کو متواتر بدلتے رہتے ہیں، اس کی حیات عارضی ہوتی ہے اور وہ چند صدیوں کے لئے بھی ایک نہج پر قائم نہیں رہتا۔اقبالؔ کی ''ریاستِ عالمگیر'' مذہبی ہے، خدائی ہے، آدرش ہے اور ابدی ہے۔مگر بایں ہمہ اقبالؔ یہ

نہیں کہتا کہ حب الوطن حب الایمان کی نقیض ہے۔کُل میں جزو ہوتا ہے، عالمگیر اخوت میں حبِ وطن پوشیدہ ہے۔اسلامیانِ ہند کے رایت پر دو نشان ہیں۔اسلامیتِ محض اور وطنیت، اور دونوں زندگی کی ایک ہی منزل کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔اگر چہ راہیں الگ الگ ہیں (۲۰)

درحقیقت اقبالؔ میں مذہب کے غائر مطالعہ اور عمیق جذبۂ حب الوطنی کا امتزاجِ کامل ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ اس کا سیاسی مطمحِ نگاہ اس کے بلند مذہبی نصب العین کے ماتحت ہے۔سیاسی نقطۂ خیال اور مذہبی مقصدِ نظر کے اختلاط نے اس کے سیاسی فلسفہ کو ایک نئی حیثیت دیدی ہے۔

فریڈرک نٹشے (۲۱) کے خیال میں فن کی دو شکلیں ہیں۔اپالونی (Apollonian) اور ڈایونیسی (Dionysian)۔اپالونی پُر وقار اور سنجیدہ تفکر ہے۔ڈایونیسی طوفان اور ہیجان کا دوسرا نام ہے۔ نیٹشے کا ''ارشاداتِ زرتشت'' جو عہدِ حاضر کے جرمنی کا شاہکار ہے بلحاظ ہر دو موضوع اور طرزِ تحریر ڈایونیسی ہے۔اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی بھی جو دونوں اسلام کی حیاۃ ثانیہ کے نشانات ہیں اسی قبیل سے ہیں۔

کیا اقبالؔ نیٹشے کے زیرِ اثر ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے۔ اگر چہ وہ ہمیشہ مستعار چیز کو جلا دے کر ایک نئی اور عجوبہ چیز بنا دیتا ہے۔نیٹشے

میں اس کے ماخذ حکایتِ ''الماس وزغال'' (اسرارِ خودی) سے دیکھے جا سکتے ہیں جو تصنیف مندرجۂ بالا کی حکایت ۲۹ (پتھر و کوئلہ سے ماخوذ ہے) مگر چونکہ اقبالؔ نیٹشے سے بزرگ تر شاعر ہے اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا ہے کہ الماس اس کا اپنا بن گیا ہے۔

نیٹشے کی طرح اقبالؔ بھی حریت فکر و فعل کا حامی ہے۔ اس نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے کی جرأت سے سرفراز کیا ہے۔ اس کی حیات افروز مثنویوں کا جو حیرت انگیز اثر ہوا ہے وہ شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔

''میں اس طرح مرد و عورت کو چاہتا ہوں۔ ایک جنگ کے قابل اور دوسری امومیت کے لائق''۔ نسائیت اقبالؔ کے نزدیک امومیت کے ہم معنی ہے۔ (۲۲) ''اے لوگو ڈرو اپنے خدا سے جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا اور تمہارے جوڑے پیدا کئے اور پھر ان دونوں سے کئی مرد اور عورتیں پیدا کیں۔'' (۲۳)۔ اور نسائیت کے لئے اسوۂ کاملہ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ ہیں۔ وہ دُختِ رسولؐ ہیں۔ بتولِ علیؓ اور اُمّ حسینؓ شہیدِ کربلا ہیں۔ جب شاعر کی آنکھ عورت پر پڑتی ہے تو وہ اس سے پرے خاتونِ جنت کو دیکھتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کی آنکھیں دن رات اپنی اولاد کو دیکھتی ہیں اور اسلامی دنیا پر بارشِ ضیاء و نور کر رہی ہیں (۲۴)

عفّت وعصمتِ مستورات وہ بنیادی پتھر ہے جس پر مذہب اور سیاست کی دیواریں قائم ہیں۔ آج کل کی نام نہاد آزاد عورت جو ایک محدود خاندان پر یقین رکھتی ہے سلطنت کے زوال اور مذہب کے ادبار کی نشانی ہے۔ (۲۵)۔ اقبالؔ نے ایک نہایت اہم سوال کو چھیڑا مگر اس نوعی بحث کو طول دینے سے احتراز کیا۔ اور اس کے جملہ پہلوؤں کو منظرِ عام پر لانے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ بہت پر لطف ہو، اگر وہ نسائیت کے بعض مسائل کی توضیح کر دیں، مثلاً مرد اور عورت کے لئے غیر مساوی شرائط نکاح یا پھر فقہائے قدیم کے اصولوں کی کوئی نئی تاویل یا توجیہہ پیش کریں۔

اقبالؔ بعض معاملات میں ردسو (۲۶) کی مانند ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پھر سے عہدِ نبوی کے شاندار شب و روز آ جائیں۔ اس کے تمام خیالات اسی ایک خواب کی تعبیر ہیں۔ ردسو فطرت کی طرف جانا چاہتا ہے۔ اقبالؔ دشتِ حجاز پر مٹا ہوا ہے۔ اس کا دل دکھتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ مسلمان تہذیبِ حاضرہ کے تصنع اور چمک دمک سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں جس میں سطحی اور تعیش کے سوا کچھ نہیں۔ اسلامی روایات عربی ہیں۔ اس لئے انہیں اپنے شریفانہ جذبات اور قدرتی فطانت کو برقرار رکھنا چاہئے۔ یورپ کی نقل کسی طرح سود مند نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ایرانی اوضاع و اطوار نے ماضی

میں کچھ فائدہ نہیں پہنچایا، غیر ملکی خیالات کا مبالغہ آمیز اور غلامانہ تتبع ہر ایک قوم کے لئے مہلک ثابت ہوا ہے (۲۷)

لیکن اسلامی سوسائٹی ان پرانی روایات پر پھر کیسے قائم کی جا سکتی ہے۔ ''تاریخ قوم کے لئے وہی کام دیتی ہے جو حافظہ فرد کے لئے''۔ مسلمانوں کی تمام حیاتِ ماضی، ان کے تمام محسوسات و مزعومات، عزائم اور کامیابیاں اس دن سے جب ان میں قومی و مذہبی زندگی کا احساس پیدا ہوا اوراقِ تاریخ میں غیر فانی طور پر محفوظ ہیں اور تاریخ کو اپنے آپ کو دہرانا چاہئے (۲۸) زندگی کو سادہ بناؤ۔ اس میں جھوٹ، تصنع، فرقہ وارانہ خیالات اور غیر مخلصانہ وخود غرضانہ خواہشات کا گزر نہ ہو۔ اخلاقی، دماغی اور سیاسی بزدلی جو آج اسلام کی انفرادی حیثیت کی جڑیں کاٹ رہی ہے، اسے دور کرو۔

اس کے معنی رجعتِ قہقری نہیں۔ مصلح کا کام ماضی کے شاندار عہد کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ اس سے مراد سادہ اخلاق، زندگی پر ایک مردانہ نظر اور عرب کی شجاعانہ جاں بازی کے ذریعے مسلمانوں میں مذہبی عصبیّت پیدا کر کے ان کا دلدر کاٹنا ہے۔ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ ہر طرح کی بزدلی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکے۔

جب مثنویوں کا علمِ کلام ہر جگہ سمجھ میں آ جائے گا تو تمام اسلامی دنیا میں وہ لہر چلے گی جس کا نتیجہ نہایت شان دار ہے۔اقبالؔ ایک صاحبِ بصیرت شخص ہے وہ اسلام کے شاندار اور بے نظیر زریں ماضی اور مستقبل میں اس کی سعادت کا نظارہ کرتا ہے مگر وہ مستقبل ایسا ہے جیسے اس کے ہر طرف دھند چھائی ہے اگر چہ دھند گہری نہیں ہے۔

بعض دفعہ اس ملک میں یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ آخر مثنویوں کو اردو کی بجائے فارسی میں لکھنے سے کیا فائدہ مترتب ہوگا؟ اقبالؔ ان لوگوں میں سے ہے جو گاہے گاہے ایک پیغام اور ایک مقصد کے ساتھ منصۂ شہود پر آتے ہیں۔اس کا پیغام تمام اسلامی دنیا کے لئے ہے۔اس کی مثنویاں بچوں کے مدارس میں سعدی کی گلستاں اور دہلی، کابل، طہران، قازان، استنبول، مدینہ اور مکہ کی جامع مسجدوں کے منبروں پر مثنویٔ مولانا رومؔ کی جگہ استعمال کرنے کے لئے ہیں۔

مثنویاں بحرِ رمل مسدس مقصور میں لکھی گئی ہیں۔بحرِ رمل میں یہ تبدیلی غزل اور مثنوی میں متداول ہے۔مثنوی معنوی بھی اسی بحر میں لکھی ہوئی ہے پہلی مثنوی (اسرارِ خودی) زیادہ حقیقی ہے دوسری (رموزِ بیخودی) زیادہ تخیلی ہے۔رموز میں اگر تھوڑی سی حکایتیں اور ہو جاتیں تو دماغ پر اس کی بھی وہی

حقیقی گرفت ہوتی جو اسرار کی ہے۔ یہ کمی رموز کے نصف آخر میں خصوصاً بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ کوئی ایسا نقص نہیں جو مصنف دور نہیں کر سکتا۔

اقبال نے فارسی ادبیات کی، جھوٹے اور مصنوعی ادبُ القدماء سے اصلی ادبُ القدماء کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ صائب کے بعد کے شعراء عہدِ زرّیں کی ایک غیر شعوری اور مدہم سی گونج رہ گئے تھے۔ اقبال کا پھر سے اساتذۂ قدیم کی روش اختیار کرنا اس وجہ سے ہے کہ وہ بیدل اور اس کے متبعین کی شاعری کے خلاف ہے (۲۹) جو رنگین پردوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ جس میں حسن و کشش تو ہے مگر قوتِ عمل نہیں۔ اس کا طرزِ تحریر مولانا روم کا ہے لیکن الفاظ ایسے ہیں جیسے کسی مرصّع تلوار کے دستے میں موتی جڑے ہوں لیکن باوجود اپنے اس عظیم الشان پیشرو کی تقلید کے اقبال یقیناً بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ نو بیدار مشرق کی روح ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہی تھی اور اقبال کی شاعری نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس نے ایرانی شاعری کی واماندہ رگوں میں خونِ تازہ دوڑا دیا ہے اور حسنِ صوری کے ساتھ قوتِ معنوی کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔ مثنویوں کی زبان بہت پُر شوکت ہے لیکن اس مردانگی کے باوجود اس میں لوچ اور لچک

ہے۔آج جبکہ فارسی زبان خود اپنے وطن میں اس قدر بدنما ہوگئی ہے اقبالؔ اس کے شباب کی یاد دلاتا ہے۔فارسی ادب ایک خطرناک دور سے گزر رہا ہے۔ایک طرف خود ایران میں ادبی انحطاط نمایاں ہے،دوسری طرف ایک موسیٰ نے اپنے عصا سے چٹان کو ضرب لگائی ہے اور ایک نیا کوثر پھوٹ بہا ہے جو بنی اسرائیل کے بارہ چشموں سے کسی طرح کم نہیں (۳۰)

☆☆☆☆☆☆☆

ضمیمہ

۱؎ اس مضمون کو علامہ ممدوح نے حکایت ''طائرے کہ از تشنگی بے تاب بود'' اور حکایت ''الماس و زغال'' میں بیان فرمایا ہے۔ مؤخر الذکر میں جب کوئلہ الماس سے پوچھتا ہے کہ باوجودیکہ ہماری پیدائش ایک کان سے ہوئی ہے کیا وجہ ہے کہ تو سرِ تاجِ شہنشاہاں ہوتا ہے اور میں انگیٹھی میں جلتا ہوں۔ تیری قدر رہتی ہے اور میں ہر جگہ ذلیل ہوں:

گفت الماس اے رفیقِ نکتہ بیں　　تیرہ خاک از پختگی گردد نگیں
تا بہ پیرامونِ خود در جنگ شد　　پختہ از پیکار مثلِ سنگ شد
پیکرم از پختگی ذوالنور شد　　سینہ ام از جلوہ ہا معمور شد
خوار گشتی از وجودِ خامِ خویش　　سوختی از نرمیِ اندامِ خویش
فارغ از خوف و غم و وسواس باش　　پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش
می شود از وے دو عالم مستنیر　　ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
مشتِ خاکے اصلِ سنگِ اسود است　　کو سر از جیبِ حرم بیروں زد است
رتبہ اش از طور بالاتر شد است　　بوسہ گاہِ اسود و احمر شد است
در صلابت آبروئے زندگی است　　ناتوانی۔ ناکسی۔ ناپختگی است

(۲)

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نگردد پیشِ باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست — خاطرش مرعوبِ غیراللہ نیست
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد — فارغ از بندِ زن و اولاد شد
می کند از ماسوا قطعِ نظر — می نہد ساطور برحلقِ پسر
با یکی مثلِ ہجومِ لشکر است — جاں بچشمِ اوزِ بادارزاں تراست

(اسرار صفحہ ۴۷)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر — از نبی تعلیمِ لَا تَحزَن بگیر
ایں سبق صدیقؓ راصدیق کرد — سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد
از رضا مسلم مثالِ کوکب است — در رہِ ہستی تبسم بر لب است

گر خدا داری زغم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو

قوتِ ایماں حیات افزایدت — وِردِ لَا خَوفٌ عَلَیھِم بایدت
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود — قلبِ او از لَا تَخَف محکم شود

بیمِ غیراللہ عمل را دشمن است — کاروانِ زندگی را رہزن است
بیمِ جاسوسے است از اقلیمِ مرگ — اندرونش تیرہ مثلِ میمِ مرگ
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست — اصلِ او بیم است گر بینی درست
ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است — شرک را در خوفِ مضمر دیدہ است

(رموز صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱)

یہی مضمون محاورہ "تیر و شمشیر" اور حکایت "شیر و عالمگیر" میں بیان کیا گیا ہے۔ آخر الذکر کے دو شعر درج ذیل ہیں:

عشق را آتش زنِ اندیشہ کن — روبہٗ حق باش و شیری پیشہ کن
خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس — خوفِ غیر از شرکِ پنہان است و بس

(رموز صفحہ ۱۱۴)

۔۳

شاہِ عالمگیر گردوں آستاں — اعتبارِ دود مانِ گور گاں
درمیانِ کارزارِ کفر و دیں — ترکشِ ما را خدنگِ آخریں
در صفِ شاہنشہاں یکتاستے — فقرِ او از تربتش پیدا ستے
روزے آں زیبندۂ تاج و سریر — آں سپہدار و شہنشاہ و فقیر
صبحگاہاں شد بہ سیرِ بیشۂ — با پرستارے وفا اندیشۂ

سرخوش از کیفیتِ بادِ سحر طائراں تسبیح خواں بر ہر شجر
شاہِ رمز آگاہ شد محوِ نماز خیمہ برزو در حقیقت از مجاز
شیر بر آمد پدید از طرفِ وشت از خروشِ او فلک لرزندہ گشت
بوئے انساں دادش از انساں خبر پنجہ عالمگیر را زو بر کمر
دستِ شہ نا دیدہ خنجر برکشید شرزہ شیرے را شکم از ہم درید
دل بخود راہے نداد اندیشہ را شیرِ قالیں کرد شیر بیشہ را
باز سوئے حق رمید آں ناصبور بود معراجش نمازِ با حضور
ایں چنیں دل خود نما و خود شکن دارد اندر سینۂ مومن وطن
تو ہم اے ناداں دلے آور بدست شاہدے را محملے آور بدست

(رموز صفحہ ۱۱۳)

۴۔

اندروقلس (Androcles) روما کا ایک رَم خوردہ غلام تھا۔ اس نے ایک غار میں پناہ لی۔ اچانک اس غار میں ایک شیر بھی داخل ہوا اور بجائے غلام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے اپنا پاؤں اس کے سامنے رکھ دیا جس میں کانٹا چبھا تھا۔ غلام نے وہ کانٹا نکال دیا اور شیر چلا گیا۔ بعد میں غلام گرفتار ہوا اور حسبِ قانون اسے شیر سے کشتی لڑنے کا حکم ملا۔ حسنِ اتفاق کہ اس کے

مقابل وہی شیر چھوڑا گیا جس کا کانٹا اس نے نکالا تھا۔ جب شیر اس پر جھپٹ کر آیا تو اسے پہچانتے ہی فوراً اس کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے پیر چاٹنے لگا۔ جب حکام نے یہ نظارہ دیکھا تو غلام کو آزاد کر دیا۔

ایک اسی طرح کا واقعہ برطانوی سفیر روما سر جارج ڈیوس کا بھی ہے لیکن طوالت سے خالی نہیں اس لئے چھوڑتا ہوں۔

۵۔

مساواتِ اسلامی کا مضمون نہائت تفصیل سے رموز کے باب رسالت میں درج ہے۔ میں صرف ''حکایت سلطان مراد و معمار'' سے چند اشعار درج ذیل کرتا ہوں:

بود معمارے از اقلیم خجند — در فنِ تعمیر نامِ او بلند
ساخت آں صنعت گر فرہادزاد — مسجدے از حکم سلطانِ مراد
خوش نیامد شاہ را تعمیر او — خشمگیں گردید از تقصیر او
آتشِ سوزندہ از چشمش چکید — دستِ آں بیچارہ را از خنجر برید
جوئے خوں از ساعدِ معمار رفت — پیشِ قاضی ناتوان و زار رفت
آں ہنرمندے کہ دستش سنگ سفت — داستانِ جورِ سلطاں باز گفت
قاضیِ عادل بدنداں خستہ لب — کرد شہ را درحضورِ خود طلب

رنگِ شہ از ہیبتِ قرآں پرید — پیشِ قاضی چوں خطا کاراں رسید
گفت شہ از کردہ خجلت بردہ ام — اعتراف از جرمِ خود آوردہ ام
گفت قاضی فی القصاص آمد حیٰوٰۃ — زندگی گیرد بایں قانوں ثبات
عبدِ مسلم کمتراز احرار نیست — خونِ شہ رنگیں تراز معمار نیست
چوں مراد ایں آیۂ محکم شنید — دستِ خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تابِ خاموشی نماند — آیۂ بالعدل وَالا حسان خواند
گفت از بہرِ خدا بخشیدمش — از برائے مصطفٰے بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر — سطوتِ آئینِ پیغمبر نگر
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے ست — بوریا و مسندِ دیبا یکے ست
(رموز صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۵)

:۶

رالف والڈو ایمرسن (۱۸۰۳ء تا ۱۸۸۲ء) امریکہ کا مشہور مصنف۔ انیسویں صدی کے اخلاقیات پر اس کی تصنیفات اور تعلیم نے نہایت گہرا اثر ڈالا۔ اس کا فلسفۂ خود اعتمادی و خودداری اور اس کا روح کے احکام کی پابندی پر زور دینا بہت مؤثر ثابت ہوا اور تا حال اس کے خیالات کا دائرۂ اثر ترقی پذیر ہے۔

:۷

راهب دیرینه افلاطوں حکیم — از گروهِ گوسفندانِ قدیم
گفت سرّ زندگی در مُردن است — شمع را صد جلوه از افسردن است
بر تخیّل ہائے ما فرماں رواست — جامِ او خواب آور و گیتی رُباست
گوسفندے در لباسِ آدم است — حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است
عقلِ خود را بر سرِ گردوں رساند — عالمِ اسباب را افسانه خواند
کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات — قطعِ شاخِ سروِ رعنائے حیات
فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت — حکمتِ او بود را نابود گفت
بسکه از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتهٔ معدوم بود
منکرِ ہنگامهٔ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشهود گشت
زنده جاں را عالمِ امکاں خوش است — مرده دل را عالمِ اعیاں خوش است
آہوش بے بہره از لطفِ خرام — لذتِ رفتار بر کبکش حرام
شبنمش از طاقتِ رم بے نصیب — طائرش را سینه از دم بے نصیب
ذوقِ روئیدن ندارد دانه اش — از تپیدن بے خبر پروانه اش
قوم ہا از سُکرِ او مسموم گشت — خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

(اسرار صفحه ۳۴ تا ۳۶)

:۸

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ؕ
(البقر ۳۰)

:۹

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں افلاطون، اس کے فلسفہ اور فلاطینوس اور افلاطونیت جدیدہ (اشراق) کی نسبت کچھ تھوڑا سا لکھ دیا جائے۔ کیونکہ یہ لفظ مضمون میں اکثر استعمال ہوئے ہیں:۔

(۱) افلاطون (۴۲۹۔۳۴۷ق۔م) سقراط کا شاگرد تھا۔ اس کا اصلی نام ارسطاقلس تھا مگر اس کے چوڑے چکلے سینے کی وجہ سے سقراط نے اس کا نام افلاطون رکھا۔ اس نے فلسفہ کو تین شاخوں میں تقسیم کر دیا۔ اخلاقیات، منطق (مابعد الطبیعات) اور الٰہیات۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے تمام مخلوق کو اپنی شکل پر بنانے کا خیال کیا۔ اس نے پہلے روح کو بنایا جو محسوس اور معقول کے درمیان توصل کا کام دیتی ہے۔ اس روح کے ساتھ اس نے جسدِ خاکی کو ملایا۔ روح جسم کے تین حصوں میں رہتی ہے، دماغ، دل، انتڑیاں اور ان سے بالترتیب عقل، حوصلہ اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ وہ خدائی کی طرح مادّہ کو بھی ازلی مانتا ہے۔ اس کے نزدیک تمام علم اپنی انتہا میں واحد اور آزاد ہے۔ خدا

تمام چیزوں کا معیار ہے اور اس میں ہی ہمت اور عقل کا اجتماع ہوتا ہے اور قدرت میں جو کچھ اصلی ہے اور جو خیالات وقوانین کا مجموعہ ہے خدا سے نکلا ہے۔اس کا مسئلہ اعیانِ نامشہود مشہور ہے۔اس کی کتاب الجمہوریت اردو میں ترجمہ ہو چکی ہے اور اس کے نصب العینی سیاسیات کو واضح کرتی ہے۔

(ب)۔فلاطینوس (۲۰۳ یا ۲۰۴ میں پیدا ہوا اور ۲۶۲ اور ۲۷۰ کے درمیان فوت ہوا) نے افلاطونیت جدیدہ کو مرتب کیا۔اپنے خیال میں وہ افلاطون کا شارح اور متبع تھا۔مگر اس کے خیالات اپنے پیشرو سے کچھ اس قدر مختلف ہیں کہ افلاطون سے ان کی نسبت بھی غلطی ہے۔فلاطینوس کے فلسفہ کی قدر و قیمت اس کے خیالات کی وجہ سے نہیں بلکہ بوجہ اپنی تاریخی اہمیت اور بعض انسانی طبائع کے تجزیہ کی وجہ سے ہے۔افلاطون کے نزدیک عقل میں جو کچھ بہترین اور اعلیٰ ترین ہے اس کا نام خیر ہے۔فلاطینوس خیر کو تجریدِ محض خیال کرتا ہے۔افلاطون انسانی اخلاق کی معراج عقلِ انسانی کے ذریعے تتبع خداوندی قرار دیتا ہے۔فلاطینوس تتبع اور خود صفاتِ اللہ کو بنگاہِ حقارت دیکھتا ہے۔اور انسانی مطمحِ نظر ادغام بر الہٰ یقین کرتا ہے۔فلاطینوس کے نظریہ کے مطابق روح اپنے مبداء سے ایسے ہی نکلی ہے جیسے سورج سے شعاعیں اور اب غیر ارادی طور پر اپنے منبع کو دیکھنے کے لئے تگ و دو کر رہی ہے۔اس

حرکت میں اس سے تصور اور تصور سے خیال پیدا ہوتا ہے۔ یہ خیال انسانی روح کا آفرینندہ۔ مادۂ خیر کا زیریں ترین مقام ہے اور اسی کی ارتقائی حالت خیر ہے۔ وہ انسان اور خدا کے درمیان بلاواسطہ تعلق کا قائل ہے۔

۔۱۰

ابوالندیم۔

۔۱۱

ابوالفتح محمد الشہرستانی مصنف کتاب الملل والنحل جس میں مختلف سنّی فرقوں کا حال بالتفصیل درج ہے۔ کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ سالِ وفات ۱۱۵۳ء مطابق ۵۴۸ھ ہے۔

۔۱۲

شیخ احمد سرہندی کا لقب مجدّد الفِ ثانی تھا۔ شیخ عبدالوحید فاروقی سرہندی کے فرزندِ ارجمند تھے۔ سرہند ۱۵۶۳ء بمطابق ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے مشہور ولی اللہ خواجہ باقی باللہ کے مرید تھے۔ ان کا یقین تھا کہ ہر ہزار سال کے بعد ایک ایسا شخص پیدا ہوتا ہے جو تمام علومِ اسلامیہ میں کامل اور طاقت و شوکتِ اسلام کا بڑھانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ دعویٰ کرتے تھے کہ دوسرے ہزار سال کا مجدد میں ہوں۔ ۱۶۲۴ء بمطابق ۱۰۳۴ھ میں وفات پائی۔ مقبرہ

سرہند میں ہے۔

۱۳۔

در شریعت معنیٔ دیگر مجو غیرِ ضو در باطنِ گوہر مجو
ایں گہر را خود خدا گوہر گراست ظاہرش گوہر بطونش گوہراست
علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصلِ سنّت جز محبت ہیچ نیست
فرد را شرع است مرقاتِ یقیں پختہ تر از وے مقاماتِ یقیں
ملت از آئینِ حق گیرد نظام از نظامِ محکمے خیزد دوام
با تو گویم سرِّ اسلام است شرع شرع آغاز است و انجام است شرع
شارعِ آئیں شناسِ خوب و زشت بہرِ تو ایں نسخۂ قدرت نوشت
از عمل آہن عصب می سازدت جائے خوبے در جہاں اندازدت
خستہ باشی استوارت می کند پختہ مثلِ کوہسارت می کند
ہست دینِ مصطفٰے دینِ حیات شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا آنچہ حق می خواند آں سازد ترا
صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دلِ آہن رباید زنگ را

(رموز صفحہ ۱۴۶ تا ۱۴۸)

-۱۴

فلسفۂ عمل علامہ اقبالؔ کا بڑا دل پسند موضوع ہے۔انھوں نے اپنی تمام کتابوں میں اس کی تعلیم دی ہے اور ہر جگہ نئے انداز سے دی ہے۔اگر جگہ تنگ نہ ہوتی تو دوسری کتب سے بھی حوالہ جات پیش کرتا مگر دامانِ نگہ تنگ و گل حسنِ تو بسیار۔صرف اسرار و رموز پر ہی اکتفا کرتا ہوں اور وہ بھی صرف ایک جگہ سے۔ضرورت ہے کہ ناظرین کتاب کو خود بہ نگاہِ غائر مطالعہ کریں۔

اے ز جورِ چرخِ ناہنجار تنگ	جامِ تو فریادیٔ بیدادِ سنگ
نالۂ و فریاد و ماتم تا کجا	سینہ کوبی ہائے پیہم تا کجا
درعمل پوشیدہ مضمونِ حیات	لذّتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلّاقِ جہانِ تازہ شو	شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نا مساعد ساختن	ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خوددارے کہ باشد پختہ کار	با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد بامزاجِ او جہاں	می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را	می دہد ترکیبِ نو ذرّات را
می کند از قوّتِ خود آشکار	روزگارِ نَو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست	ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم زورِ خود را از مہماتِ عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش است چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
حربۂ دوں ہمتاں کین است و بس زندگی را ایں یک آئین است و بس
زندگانی قوتِ پیداستے اصلِ او از ذوقِ استیلاستے
عفوِ بے جا سردیٔ خونِ حیات سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات
ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است ناتوانی را قناعت خواندہ است
ناتوانی زندگی را رہزن است بطنش از خوف و دروغ آبستن است

(رموز صفحہ ۵۴ تا ۵۶)

۱۵۔

سقراط (۴۶۹ تا ۳۹۹ ق۔م) یونانی فلسفی افلاطون کا استاد۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اپنے نفس کو جانو یعنی اپنی ناواقفیت کا اندازہ کرو۔ روح کی تعریف وہ یوں کرتا ہے۔ ہمارے اندر وہ چیز جو علم بھی رکھتی ہے اور بے علمی بھی، خیر بھی اور شر بھی۔ اپنی خدا پرستی کی وجہ سے زہر سے ہلاک ہوا۔

۱۶۔

اپیکورس (۳۴۲ تا ۲۷۰ ق۔م) یونانی فلسفی۔ اسکی تعلیم کا بنیادی اصول یہ تھا کہ چونکہ خوشی اور غم ہی دنیا کے خیر اور شر ہیں اس لئے فلسفہ کا مقصد اولیٰ بر

حصولِ مسرّت اور انعدام کلفت ہونا چاہئے۔ اسکے نزدیک سکونِ قلب مبنی بہ مراقبۂ خیر پر منتج ہوتا ہے۔ آج کل جو مشہور ہے کہ اسکی تعلیم ''کھاؤ پیو اور خوش رہو'' ہے، غلط فہمی پر مبنی ہے۔ نہ اسکی زندگی ایسی تھی نہ اس نے اسکی تبلیغ ہی کی۔

۱۷۔

حضرتِ علاّمہ نے ایک جگہ ایسے پیروں کی نہایت صحیح شکل کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:

شیخ در عشقِ بتاں اسلام باخت — رشتہ تسبیح از زنار ساخت
پیر ہا پیر از بیاضِ مو شدند — سخرہ بہر کودکانِ کو شدند
دل ز نقشِ لا الٰہ بیگانۂ — از صنم ہائے ہوس بت خانۂ
می شود ہر مو درازے خرقہ پوش — آہ ازیں سوداگرانِ دیں فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر — از ضرورت ہائے ملّت بیخبر
دیدہ ہا بے نور مثلِ نرگس اند — سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند
واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست — اعتبارِ ملّتِ بیضا شکست
واعظِ ما چشم بر بتخانہ دوخت — مفتیِ دینِ مبیں فتویٰ فروخت

چیست یاراں بعد ازیں تدبیرِ ما
رُخ سوئے میخانہ دارد پیر

(اسرار صفحہ۷۹)

۱۸۔

میکیاولی (۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۷ء) اطالوی مؤرخ و سیاستدان۔ وہ فلارنس میں پیدا ہوا اور وہاں مدتوں ریاست میں مناصب جلیلہ پر سرفراز رہا۔ آخر معطل کیا گیا اور اپنے جاگیری بند و بست میں بقیۂ عمر بسر کی۔ اس کی کتاب ''کتاب الملوک'' سب سے پہلے ۱۵۳۲ء میں پوپ کلیمنٹ ہفتم کی اجازت سے شائع ہوئی۔ اس میں اُس نے سیاسیات اور اخلاقیات کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کی۔ اور اس میں زمانۂ حال کے کئی سیاسئین نے اُس کی تقلید کی ہے۔ جو اپنے سیاسی اغراض و مقاصد میں اصولِ اخلاق کو دخل نہیں دیتے۔ حضرت علامہ اُس کی نسبت فرماتے ہیں:

دہریت چوں جامۂ مذہب درید مرسلے از حضرتِ شیطاں رسید
آں فلارنسویِ باطل پرست سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
نسخۂ بہرِ شہنشاہاں نوشت در گِلِ ما دانۂ پیکار کشت
فطرتِ اوسوئے ظلمت بردہ رخت حق ز تیغِ خامۂ اُو لخت لخت

بت گری مانندِ آذر پیشہ اش بست نقشِ تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دینِ او معبود ساخت فکرِ او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد نقدِ حق را بر عیارِ سود زد
باطل از تعلیمِ او بالیدہ است حیلہ اندازی فنے گردیدہ است
طرحِ تدبیرِ زبوں فرجام ریخت ایں خسک در جادۂ ایام ریخت
شب بچشمِ اہلِ عالم چیدہ است
مصلحت تزویر را نامیدہ است
(رموز صفحہ ۱۳۴ تا ۱۳۵)

۱۹۔

دانتے (۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء)۔ اٹلی کا بزرگ ترین شاعر ہے۔ اُس کی ڈیوائن کومیڈی (طربیۂ الٰہی) مشہور و معروف چیز ہے۔ اِس میں مصنف نے طبقاتِ علوی کی سیر کا حال بیان کیا ہے۔ اُسے اُس نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، دوزخ، دار کفارہ اور جنّت۔ وہ خواب دیکھتا ہے کہ میں ایک گھنے جنگل میں جا نکلا ہوں۔ جہاں ورجل (اس سے پہلے کا ایک اطالوی شاعر) کا ہیولیٰ ظاہر ہوتا ہے۔ اور دوزخ اور دار کفارہ میں اس کی رہنمائی کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ دوزخ کے جو نظارے دانتے نے بیان کئے ہیں،

بلحاظ دقتِ نظر، اعتقادِ تامہ اور جزئیاتِ کردار نگاری غالباً بے نظیر ہیں۔ اور شاید کسی ایک مصنف کے کلام میں اتنی خوبیاں بیک وقت نہیں ملیں گی۔ دار کفارہ میں نظارے تقریباً وہی ہیں۔ البتہ سزا وعقوبت عارضی ہے۔ جنتِ سماوی میں اُس کا رہبر اس کی معشوقہ بطریس ہے۔ سات طبقوں کی سیر کے بعد وہ آٹھویں طبقہ میں پہنچتا ہے۔ جہاں یسوع مسیح کو اپنے صاحبِ عظمت حواریوں کے حلقے میں دیکھتا ہے۔ نویں طبقے میں وہ اپنے آپ کو روحِ کُل کی موجودگی میں محسوس کرتا ہے۔ اور ارواحِ مرحومہ کو ایک لا محدود دائرے میں تختوں پر بیٹھا ہوا دیکھتا ہے۔ خداوند تعالیٰ خود دسویں طبقے میں ہے جسے وہ وفورِ نور کے باعث نظارہ نہیں کرسکتا۔ ان تمام رویائی تجربات کی بنیاد دراصل اعتقادِ حسنِ خیر و زشت، شر اور محبت کی عالمگیری اور قدرتِ عظیمہ ہے اور یہ سب کچھ اس جوش وخروش اور صحت کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ الہام معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ مدتوں اس کے ہم وطنوں کا یہ خیال رہا کہ یہ تمام حالات الہامی ہیں۔

۲۰۔

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست　　بادۂ تُندش بہ جامے بستہ نیست
ہندیٔ و چینیٔ سفالِ جامِ ماست　　رومی و شامی گِلِ اندامِ ماست

قلب ما از ہند و روم و شام نیست — مرز بومِ او بجز اسلام نیست
مسلم استی دل باقلیمے مبند — گم مشو اندر جہانِ چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم — دردلِ او یاوہ گردد شام و روم
عقدۂ قومیتِ مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد — بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں — مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں
آں کہ در قرآں خدا او را ستود — آں کہ حفظِ جانِ او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش — لرزہ بر تن از شکوہِ فطرتش
پس چرا از مسکنِ آبا گریخت؟ — تو گماں داری کہ از اعدا گریخت
قصہ گویاں حق زما پوشیدہ اند — معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است — ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو — یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

از فریبِ عصرِ نو ہشیار باش
رہ فتد اے راہ رو ہشیار باش

(رموز صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۲)

۲۱۔

فریڈرک نیٹشے (۱۸۴۴ء تا ۱۹۰۰ء) جرمن شاعر اور فلسفی۔ لیکن چونکہ وہ اصل میں شاعر تھا اس لئے اس کے نزدیک فلسفہ بھی زندگی اور فکر کی تنقید ہی ہے۔ اس کے خیال میں تمام مخلوق میں جس میں آدمی بھی شامل ہے آرزوئے حیات سب سے زیادہ ہے جس کے معنی ہیں کہ طاقت حاصل کی جائے اور تمام رکاوٹوں کا قلع قمع کیا جائے جو زندگی کو مشکل بناتی ہیں۔ موجودہ انسان مخلوقِ خداوندی کا منتہائے مقصود نہیں۔ بلکہ جیسے جانور کی ارتقائی صورت انسان ہے، ایسے ہی انسان بھی عارضی ہے اور اس کے بعد مکمل انسان (فوق البشر) ہوگا جس میں حسن و طاقت، عقل و اخلاق، قوتِ ارادی و عمق نگاہ بدرجۂ کمال ہوں گے۔ اور ان الفاظ کے معانی بھی ان کے موجودہ مطلب سے کچھ زیادہ وسیع ہوں گے۔ محبت، رحم اور ہمدردی اس کے لئے بے معنی الفاظ ہیں۔ اس کے نزدیک فطرت اِن الفاظ سے مبرّا ہے اور مندرجہ بالا مقصود کی طرف بغیر دائیں بائیں دیکھے جا رہی ہے۔

اس طرح گویا اُس نے انتہا درجے کی انفرادیّت کی تعلیم دی۔ جس میں زندگی کی محبت مقصدِ حیات گنا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اشتراکیت اور فوصتوئیت (فسطائیت)، مساواتِ سیاسی اور حکومتِ عوام کا لانام کے سخت

خلاف ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جرمنوں کی موجودہ ذہنیت کے لئے بہت حد تک وہی ذمہ دار ہے اور گزشتہ جنگِ عظیم کی تہ میں اسی کی تعلیم تھی۔

۲۲۔

یَا یُّھا النَّا سُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَفْسٍ وَّا حِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَا لاً کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ج

(نساء آیت ۱)

۲۳۔

نغمہ خیز از زخمۂ زن سازِ مرد — از نیاز او دوبالا نازِ مرد
پوششِ عریانیٔ مرداں زن است — حسنِ دلجو عشق را پیراہن است
آنکہ نازد بر وجودش کائنات — ذکرِ او فرمود باطیب والصلوٰۃ
نیک اگر بینی امومت رحمت است — زانکہ او را با نبوت نسبت است
از امومت پختہ تر تعمیرِ ما — در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے — حرفِ امت نکتہ ہا دارد بسے
ملّت از تکریمِ ارحام است و بس — ورنہ کارِ زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتارِ حیات — از امومت کشفِ اَسرارِ حیات
از امومت پیچ و تابِ جوئے ما — موج و گرداب و حبابِ جوئے ما

(رموز صفحہ ۱۷۳ تا ۱۷۴)

۲۴۔

سیرتِ فرزند ہا از امّہات　　جوہرِ صدق و صفا از امّہات

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ　　مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

بہرِ محتاجے دلش آں گونہ سوخت　　با یہودے چادرِ خود را فروخت

نوری و ہم آتشی فرماں برش　　گم رضایش در رضائے شوہرش

آں ادب پروردۂ صبر و رضا　　آسیا گردان و لب قرآں سرا

گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز　　گوہر افشاندے بدامانِ نماز

اشکِ او بر چید جبریل از زمیں　　ہم چو شبنم ریخت بر عرشِ بریں

رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست　　پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰؐ است

ورنہ گردِ تربتش گر دیدمے

سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدمے

اسی سلسلے میں ''خطاب بہ مخدراتِ اسلام'' بھی زیرِ نظر رہے۔

(رموز صفحہ ۱۷۸)

۲۵۔

آں تہی آغوش نازک پیکرے　　خانہ پرورِ نگاہش محشرے

فکرِ او از تابِ مغرب روشن است　　ظاہرش زن باطنِ او نازن است

بندہائے ملّتِ بیضا گسیخت　　تاز چشمش عشوہ حاصل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش　　از حیا نا آشنا آزادیش
علمِ او بارِ اُمومت برنتافت　　بر سرِ شامش یکے اختر نتافت
ایں گل از بستانِ ما نا رُستہ بہ
داغش از دامانِ ملّت شُستہ بہ

(رموز صفحہ ۱۷۵)

-۲۶

روسو (۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء) عجیب انقلابی دل و دماغ کا مالک تھا۔ فرانس میں جب حکومت نے اس کو جلا وطن کیا تو انگلستان پہنچا۔ یہاں بھی ہوا راس نہ آئی تو واپس فرانس آیا اور عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ وہ موجودہ تہذیب و تمدن کے سخت مخالفین میں سے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کی ابتدائی فطری حالت بہترین تھی۔ اُس میں عجیب طور پر سرگرم جذبۂ محبت و رافت کے ساتھ ساتھ تمام قائم شدہ اصول و قواعد کے خلاف سخت مخالفانہ و جارحانہ خیالات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انقلابِ فرانس کے لئے وہ بھی بہت حد تک ذمہ دار گردانا گیا ہے۔

۔۲۷

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن ۔۔۔ بر عیارِ زندگی او را بزن
فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است ۔۔۔ چوں درخشِ برق پیش از تندر ست
فکرِ صالح در ادب می بایدت ۔۔۔ رجعتے سوئے عرب می بایدت
دل بہ سلمائے عرب باید سپرد ۔۔۔ تا دمد صبحِ حجاز از شام کرد
از چمن زارِ عجم گل چیدۂ ۔۔۔ نو بہارِ ہند و ایراں دیدۂ
اندکے از گرمئی صحرا بخور ۔۔۔ بادۂ دیرینہ از خرما بخور
سر یکے اندر بہر گرمش بدہ ۔۔۔ تن دمے با صرصرِ گرمش بدہ

(اَسرار صفحہ ۴۲)

مگر رموز میں اس سے اور بھی صاف اور واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

تا شعارِ مصطفیٰ از دست رفت ۔۔۔ قوم را رمزِ بقا از دست رفت
آں نہالِ سر بلند و استوار ۔۔۔ مسلمِ صحرائی اشتر سوار
آنکہ کشتے شیر را چوں گوسفند ۔۔۔ گشت از پامالِ مورے دردمند
آنکہ عزمش کوہ را کاہے شمرد ۔۔۔ با توکل دست و پائے خود سپرد
کوششِ او با قناعت ساز کرد ۔۔۔ تا بہ کشکولِ گدائی ناز کرد
شیخ احمدؒ سیدِ گردوں جناب ۔۔۔ کاسبِ نور از ضمیرِ آفتاب

گل کہ می پوشد مزارِ پاکِ او لالہ گویاں دم از خاکِ او
بامریدے گفت اے جانِ پدر از خیالاتِ عجم باید حذر
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت از حدِ دینِ نبیؐ بیروں گذشت
اے برادر ایں نصیحت گوش کن پندِ آں آقائے ملت گوش کن
قلب رازیں حرفِ حق گرداں قوی
با عرب در ساز تا مسلم شوی
(رموز صفحہ ۱۴۸ تا ۱۴۹)

۲۸۔

چیست تاریخ اے ز خود بیگانہ داستانے قصہٗ افسانہ ؟
ایں ترا از خویشتن آگہ کند آشنائے کار و مردِ رہ کند
روح را سرمایۂ تاب است ایں جسمِ ملت را چو اعصاب است ایں
ہم چو خنجر بر فسانت می زند باز بر روئے جہانت می زند
شمعِ او بختِ اُمم را کوکب است روشن از وے امشب و ہم دیشب است
چشمِ پُرکارے کہ بیند رفتہ را پیشِ تو باز آفریند رفتہ را
ضبط کن تاریخ را پایندہ شو از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو
سر زند از ماضیِ تو حالِ تو خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است   بے کشاں را شورِ قلقل زندگی است
(رموزصفحہ۱۷۲ تا ۱۷۳)

۲۹۔

بیدلؔ کے متعلق اقبالؔ کا یہ خیال بعد میں بالکل بدل گیا تھا۔تعجب ہے کہ ڈاکٹر بجنوری نے بھی اُن کے پہلے قابلِ اصلاح خیال کی تائید کی ہے۔ ''الحمراء''۔

۳۰۔

وَ اِذِسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَااضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَاعَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْعَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ
(البقر ۶۰)

☆☆☆☆☆

رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرہ آفاق تصنیف

گیتان جلی

جب رابندر ناتھ ٹیگور کی کتاب ''گیتان جلی'' (بہارِ نغمہ) شائع ہوئی' میں انگلستان میں موجود تھا۔ جس طرح شورش و انقلاب کے بعد سیاسیات کے عالم میں ہر شے زیر و زبر ہو جاتی ہے ٹیگور کی آمد اور فتوحات نے قلمرو سخن کو درہم برہم کر دیا تھا۔ W. B. Yeats آئرلینڈ کے افسر الشعراء Earnest Rhys ویلز کے ادیب محترم اور خود ملک الشعرائے انگلستان ان کو موجودہ زمانہ کی شاعری کا تاج پیش کر رہے تھے۔

جہاں سے میں اکثر کتابیں خریدا کرتا تھا' داخل ہوا۔ دکان دار نے اپنے خریداروں سے از راہ فخر کہا'' یہ ٹیگور کے ہم وطن ہیں''۔ ہر طرف سے مجھ پر یورش ہونے لگی اور'' آپ کو اور ہندوستان کو مبارک ہو'' کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

ایک خاتون۔ (گیتان جلی کتابوں میں سے اٹھا کر) ''یہ تراجم درست بھی ہیں یا نہیں؟''

ایک صاحب۔'' گیتان جلی کے لفظ کی ترکیب از روئے قواعد کیا ہے؟''

ایک دوسری خاتون۔ (گیتان جلی میں دکھلا کر) ''کیا حضرت مصنف کی صورت بالکل ایسی ہی ہے؟ ماشاء اللہ! کیا پاکیزہ' ہندوالمانی خدوخال ہیں''۔

میں نے بمشکل تمام ٹیگور کے ان غائبانہ مداحوں سے رہائی پائی۔

Kipling نے تاب نہ لاکران تمام ہنگاموں سے دور خاموشی میں پناہ لی تھی۔ ایک شب ایک بزم شعرا میں جانے کا اتفاق ہوا، وہاں ایک نوجوان شاعر نے جن کی ذات سے آئندہ انگریزوں کو بڑی امیدیں ہیں، کہا''جس دن سے ٹیگور کا کلام شائع ہوا ہے میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے اور اسی سوچ میں ہوں کہ آخر کیا کہوں''۔ اس کے بعد جب میں انگلستان سے المانیہ واپس آیا، وہ عین وہ زمانہ تھا کہ نوبل انعام کو عطا ہوئے دس بارہ روز گزرے تھے، ٹیگور کا نام زبان زد تھا اور ہر کہ ومہ کے لب پر بھی یہی تذکرہ تھا۔ علمی اور شاعرانہ دنیا میں کیا چرچے تھے، ہفتہ بھر کے اندر گیتان جلی ترجمہ ہو کر شائع ہوگئی تھی اور مہینہ کے ختم تک ''باغبان'' اور ''ہلال'' کے تراجم کے طبع ہو جانے کا اشتہار تھا۔ ایک روز میں نے ایک دکان میں چار پانچ روز کے بعد سنا کہ شاہ سیکسنی کے حکم سے مجارستان (ہنگری) کی مشہورِ زمانہ مغنیہ نے گیتان جلی کے چیدہ مقامات حفظ کر کے شاہی سرود خانے میں سنا کر

بے حساب داد حاصل کی۔

ایک مہینہ کے اندر اندر علاوہ ''باغبان'' اور ''ہلال'' کے تراجم کے رابندر ناتھ ٹیگور کی سوانح عمری بھی شائع ہوگئی۔

یہ دوممالک کی چشم دید حالت ہے' اور اقالیم میں بھی ایسی ہی قدر و منزلت ہوئی۔

اہل فرانس کو نہایت وثوق سے یقین تھا کہ نوبل انعام اناطول فرانس کو ملے گا لیکن باوجود مایوس ہونے کے وہ قدردانی میں کسی سے کم نہیں رہے۔ یورپ کی کوئی زبان ہی شاید ایسی ہو جس میں ٹیگور کا مجموعہ نظم ترجمہ نہ ہوگیا ہو۔ رومانی، سربی، مجاری زبانوں تک میں ترجمہ کا مجھے ذاتی علم ہے۔

جب میں ہندوستان واپس آیا تو میرا خیال تھا کہ یہاں کی علمی دنیا میں بھی یہی حالت ہوئی ہوگی اور ٹیگور کے اعجازِ قلم نے سب کو حیرت میں ڈال دیا ہوگا' لیکن عام طور پر تعلیم یافتہ جماعت کو ٹیگور کے نام تک سے ناآشنا اور خواص کو اس کی خوبیوں کا منکر پایا، یہاں کے علمی طبقوں میں یہ حالت دیکھی کہ سخن فہموں کو داد تک دینے میں اغماض تھا، خود بنگال میں صدائے مخالفت بلند پائی۔

ع چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ہندوستان کی منطق یہ ہے کہ ٹیگور اور اقبالؔ ہمارے ملک کے لحاظ سے بھی بڑے شاعر نہیں ہیں کجا اکفاء یورپ کے شعرا سے مقابلہ کرنا اور ان کو مغنیانِ فرنگ کا ہم پایہ خیال کرنا یا استغفر اللہ ان سے ارفع اور اعلیٰ قرار دینا نہ صرف سوءِ ادب بلکہ گناہ ہے۔ کہاں ہندوستان کی تیرہ خاک، کہاں یورپ کی خلدگاہ، یہ خاک اور وہ عالمِ پاک، یہاں کے ساکنوں کو وہاں کے مکینوں سے نسبت ہی کیا ہے۔

اگر یورپ خود ٹیگور کی تعریف میں رطبُ اللّساں ہے تو یہ کسرِ نفسی بھی کوئی مغربی ادا ہے اور اس میں بھی کوئی راز ہے، ورنہ ہند کی خاک سے کوئی فرزانہ کب اٹھ سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ "ہاں غلط اور سر بسر غلط"

ایک صاحب نے جو انگلستان کی ایک معروف کُلّیہ (یونیورسٹی) کے فرزند ہیں اور انگریزی زبان میں شاعری بھی کرتے ہیں فرمایا "ٹیگور کے خیالات عیسویت کے خیالات ہیں جو اس نے برہمو سماج کے ذریعہ سے ورثہ میں پائے ہیں۔ اہلِ یورپ نے مصلحتاً رابندر ناتھ ٹیگور کو مشہور کر دیا ہے، ٹیگور کی شہرت سے درحقیقت تبلیغِ دینِ مسیحی مقصود ہے۔"

اس اعتراض کا بہترین جواب گیتان جلی کے محض سرسری مطالعہ سے کافی اور شافی مل سکتا ہے۔ جس بنگال کا ٹیگور فرزند ہے وہ بنگال ہے جو چے تنیہ، دیو اور چندر اسین کے مشہور ناموں سے منسوب ہے۔ جس شخص نے ٹیگور کے والد ماجد دوندرا ناتھ ٹیگور کی سوانح عمری کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ ٹیگور کا مذہب اپنشدوں کی لافانی تعلیم کے سوا کسی اور عقیدہ پر مبنی نہیں۔

ایک اور نہایت ذی علم جوان نے جن کا مطالعہ نہایت ہی وسیع ہے اور جو اکثر مغربی اور مشرقی ادب سے واقف ہیں فرمایا کہ ''میں ٹیگور میں کوئی نئی بات نہیں دیکھتا۔ یہ تمام خیالات قدیم ہندو اور جدید ہندی شاعری میں موجود ہیں''۔ یہ اعتراض ایسا ہی ہے جس طرح کوئی شخص ''میر درد'' ''خواجہ حافظ'' اور ''حکیم سنائی'' کے کلاموں میں اس وجہ سے کہ تینوں تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں، امتیاز نہ کر سکے۔ یہ بجا ہے کہ ٹیگور کی بہت سی تصنیفات کالیداس سے مشابہ ہیں لیکن یہ محض اس وجہ سے ہے کہ دونوں خالص ہندی استعارات سے کام لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ٹیگور کے بہت سے خیالات کبیر سے ملتے ہیں لیکن اس کا باعث صرف یہ ہے کہ دونوں کا کلام حمد و سپاس الٰہی میں ہے۔ انگلستان میں بھی چند اشخاص نے جن کی تعداد دو تین سے زیادہ نہیں ٹیگور کے کمال کا انکار اسی پیرایہ میں کیا ہے۔

ایک صاحب ٹیگور کو شیلے کا خوشہ چیں بتلاتے ہیں اور ایک فرانسس ٹامپسن کا مقلد خیال کرتے ہیں۔

میں نے خود ایک زمانہ ہوا گیتان جلی کا ترجمہ کرنے کا قصد کیا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ ترجمہ نظم (غیر مقفی) میں کروں تا کہ جہاں تک ہو سکے کلام کی خوبی قایم رہے، لیکن چونکہ ٹیگور کے کلام کو ترجمہ کرنے میں اس کی عظمت کے لحاظ سے ایسی ذمہ داری مجھ پر عاید ہوتی تھی جس کا میں متحمل نہ ہو سکتا تھا، یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ دس پندرہ مقامات ترجمہ کر کے رہ گیا۔ یہاں بطور نمونہ کے ایک مقام کا ترجمہ درج کرتا ہوں۔

(نوش عیش)

موت جس دم دیگی دستک تیرے دروازے پہ آ
کیا تواضع اپنے مہماں کی بجالائے گا تو
مرحبا سلطانِ من حاضر ہے مینائے حیات
نوشِ عیش اور نیشِ غم دونوں کا آمیزہ ہے یہ
عمر کا میری ہے حاصل بس یہی لبریز جام
نوشِ جاں حاضر جو ہے بہرِ کرم فرمائیے

جہاں مجھے ملک کی ناقدر دانی کا افسوس رہتا تھا وہیں اپنی بے کمالی کا

رنج رہتا تھا۔ لیکن وہ بربط جس پر ٹیگور کے ترانہ توحید کی شور انگیزی بلند ہو میری آغوش میں نہ سما تا تھا، میری ارضی طبیعت اس کی سادی علوئیت کی تاب نہ لاسکی، لیکن الحمدللہ جس کام کو میں نہ کرسکا اس کو ایک قابل ادیب نے پورا کیا۔

نسل سام کے اجداد نے عرب کے اُس دشت ناپیدا کنار کی آغوش میں تربیت پائی تھی جو ایک شیشۂ ساعت کی طرح تھا اور جس میں وقت مدام ریگ افشانی میں مشغول رہتا تھا، اس صحرائے سموم میں ویرانی کے سوا کوئی آباد نہ تھا۔ جب سموم رک جاتی تھی تو ہر جانب ایک پر رعب فضا پیا خاموشی مسلط ہوجاتی تھی، کسی درندہ کی ہولناک چیخ تک سکوت کو نہ توڑتی تھی۔ یہاں قدرت محض آفتاب، ماہتاب، ستاروں اور ریت کا مجموعہ تھی۔ سورج کی تاب وتابش میں بھی ایک جلوۂ قہر تھا۔ ریت کی طپش جان اور آرام کی دشمن تھی، چاند ستارے خوبصورت ضرور تھے مگر بے فائدہ، اس لئے گو نسلِ سام نے کواکب پرستی کی بنیاد ڈالی تھی لیکن ان کے دل نے اپنے عقیدہ پر خود گواہی نہ دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو تقریر شمس وقمر کے طلوع و غروب اور ستاروں کو دیکھ کر کی وہ تمام نسل سام کی فریاد تھی جو دلوں سے زبان تک آگئی تھی۔ گویا توحید یعنی یکتائی کا خیال قدرت نے ان کے دلوں میں

خود ودیعت کر رکھا تھا۔ آفتاب کا ثانی کوئی نہ تھا، ماہتاب اپنی مثال نہ رکھتا تھا، ازل اور ابد کے تصورات بھی تمثیلاً دل میں موجود تھے، کہیں سے کہیں نکل جانے پر بھی مینائے لاجورد اور سراب دشت رفاقت نہ چھوڑتے تھے نہ صورت بدلتے تھے۔ اس لئے جب ان کو ایک ہستی سے آگاہ کیا گیا جو علایق دنیا اور قیود عالم سے آزاد ہے، سب سے بالا، موجودات سے ارفع، ازلی، ابدی، یکتا ہے اور جو مہر و ماہ ریگ دوشت عرش و فرش سے لاتعلق ہے جس کا علم قیاس و گمان بلکہ وہم سے برتر ہے، تو انہوں نے بہ دل تسلیم کر لیا کہ یہی مطلوب تھا جس کی ان کو تلاش تھی۔

آریہ نسل کے اسلاف نے حوا ایران اور وسط ایشیا سے ہندوستان آئے ان عظیم الشان بیابانوں کو جنہیں قدرت نے شیر داڑدر کی نشیمن گاہ بنایا تھا اپنی فردوگاہ مقرر کیا، دامن ہمالیہ اور بندرابن کے قدرتی سرسبز سائبان معبد اور مندر قرار دئے گئے، جدھر نظر اٹھتی تھی آب رواں اور سبزہ زار پیش نگاہ تھا، پیکر مخصوص میں خدائی کارفرما نظر آتی تھی اور ہر میدان و جبل دریا اور رود آب سے انا الحق کی صدا بلند ہوتی تھی، گونا گوں اثمار شیریں من و سلویٰ کا کام دیتے تھے اور برفاب سے لبریز چشمے پیاس بجھاتے تھے، قدرت خود قاضی الحاجات تھی، طیور کی زمزمہ سنجی بزم سماع اور شاہدان گل کی حسن آرائی

مخفل وجد تھی۔ کثرت میں ذات باری پنہاں بلکہ آشکار نظر آتی تھی۔

جب عربوں کا فارس پر اور مسلمانوں کا ہند پر تسلط ہوا تو ان دونوں کے مذہبی خیالات کا بھی ایک دوسرے پر تصرف ہوا۔ اس سے ایران میں تصوف نے فروغ پایا لیکن فطرتاً تصوف آریہ نسل کے عجمی مسلمانوں کی طبائع سے زیادہ رابط تھا۔ عربی الخیال مسلمانوں نے عموماً اپنی قدیم اسلامی روایات کو قائم رکھا۔ شاعری ایک وسیع حد تک مذہب کی تابع ہے اس لئے ایک جانب توصوفی شعرا ع خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ، خود رند سبوکش کی تفسیر بیان کرنے لگے۔

دوسری جانب اسلامی شعرا ان الفاظ کا ورد کرتے رہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
در ہر چہ خواندہ ایم وشنیدیم وگفتہ ایم

اردو شاعری میں بھی جو فارسی کا تتبع ہے دوئی کی کیفیت موجود ہے۔ ایک فریق فارسی 'ہمہ اوست' اور ایک عربی 'از ہمہ اوست' کا قائل ہے۔ اس کے مقابل میں ہندو شاعری کی بنیاد ابتداء ہی سے وحدت الوجود پر بنی ہے، ٹیگور کی شاعری ہندی شاعری ہے۔

فیضی کا سرِ دیوان شعر ہے۔

یا ازلی الظہور یا ابدی الخفا
نُور کُ فوق النظر حسنک فوق الثنا

خواجہ میر دردؔ اپنا کلام یوں شروع کرتے ہیں:۔

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
جس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے
کیا تاب گذر ہووے تعقل کے قدم کا

لیکن ٹیگور فرماتے ہیں ''ایک جام سفال ہوں جس کو وہ رندِ حقیقی رنگارنگ سے معمور کرتا ہے، توڑ دیتا ہے، اور پھر اعجازِ کوزہ گری سے وجود میں لا کر الوانِ شراب سے لبریز کر دیتا ہے، نہ میرا کوتاہ پیمانہ بھرتا ہے نہ وہ میکش سیر ہوتا ہے، نہ ہماری ازلی اور ابدی لب نوشی ہے۔

خوشی میری اسی میں ہے بنا اک جامِ گل مجھ کو
بھرے، خالی کرے، ہر دم زُلالِ زندگانی سے

یا کہتے ہیں ''دنیا ایک صنم کدہ ہے، میرا صورت گر خود میرا عاشق ہے۔ اس کا ذی حیات مس میرے تمام اعضا، پر محیط ہے''۔

یا کہتے ہیں "میں وہ منتظر عورت ہوں جو اپنے شیام سندر کے انتظار میں سُونی سیج پر طوفانی راتوں میں اس کی آمد کی گھڑیاں گنتی رہتی ہوں۔ وہ کسی جنگل کے کنارے بعید کی تاریکی کے پر پیچ عمق سے آنے والا ہے، آہ وہ بھی کیا ستم ظریف ہے، ہمیشہ اس وقت آتا ہے جب میں تھک کر سو جاتی ہوں۔ اور اپنے بربط کے نغموں سے میری نیند کو بھر دیتا ہے اور میں اسکے دیدار سے چونک چونک جاتی ہوں جس کی سانس میری نیند کو چھوچھو جاتی ہے۔

"جب صبح کو عورتوں کے ساتھ پانی بھرنے جاتی ہوں تو کنویں پر جہاں "ساھلا" اور نیم کے درخت ہیں وہ آتا ہے اور ہتھیلیاں جوڑ کر مجھ سے پانی مانگتا ہے، اس کی طلب میں کیا شیرینی ہے، یہ حلاوت عمر بھر میرے دل سے نہ جائے گی۔

جب میں کاسۂ گدائی لے کر نکلتی ہوں تو وہ بادشاہوں کا بادشاہ بن کر زریں رتھ میں سوار ایک عجیب آن بان سے آ کر میرا راستہ روک لیتا ہے اور مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے، نیچے اتر آتا ہے، میں خیال کرتی ہوں میری حیات کا لمحۂ خوش کامی آ گیا اور امید کرتی ہوں کہ اب دولت چاروں طرف بکھر جائے گی، لیکن ناگہاں وہ خود اپنا ہاتھ میرے سامنے بھیک کے لئے پھیلاتا ہے۔

یا کہتے ہیں عالم ایک محفل سماع ہے فرش زمین سے عرش بریں تک عالم امکان ترانہ معرفت سے لبریز ہے۔

بشنواز 'نے' چوں حکایت می کند   د ز جدائی ہا شکایت می کند

ادروہ 'نے' میں خود ہی ہوں"۔

پھر ااس 'نے' کو تو لے کر ہر اک کہسار ر دادی میں

زمیں میں کی ہے دم تو نے ہمیشہ تازہ موسیقی

یا کہتے ہیں کہ 'نہیں' میں تو مغنی ہوں جس کی ملازمت حضور الٰہی میں نغمہ سنجی ہے۔

جب تو دیتا حکم ہے مجھ کو کہ ہوں نغمہ سرا

فخر سے دل میرا سینہ میں سما سکتا نہیں

جب سب مغنی اپنا راگ ختم کر چکتے ہیں تو بربط نواز عالم خود بیں میں بربط اٹھالیتا ہے، اس وقت کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔

سرود تیرا کرے ہے روشن تمام عالم کو اے مغنی

ہے روح نغمہ رواں فلک پر مثالِ تارِ حیات دائم

رداں ہے گو سنگ ہوں مزاحم، ترے ترانے کا پاک دریا

ہے کیسی دل میں مرے تمنا' شریک تیرے سرود میں ہوں

صوت سرمدی کوسن کر طائرِ روح عرش آشیاں ہونا چاہتا ہے۔

اے طائران قدس راافزودہ عشقت نالہا
درحلقۂ سودائے تو روحانیاں راحالہا

چنانچہ کہتے ہیں۔

طائرِ بازو کشادہ سینۂ دریا پہ ہے
میں بھی خوش خوش ہوں رواں پیشِ نظر ہے آشیاں
کر وسیع شہبال نغمہ عرش تک آیا ہوں میں
تیراپابوسِ مقدس تو کہاں اور میں کہاں

وہ نغمہ جو اس محفل میں بجتا ہے سرودِ حقیقت ہے۔ اس سلطان الاذکار میں کوئی صدا یاندا نہیں۔

مرے نغمہ کی آرائش نہیں جز عین عریانی
لباس اور ظاہری زینت سے تن اس کا مبرا ہے
نہیں شبنم صفت اک پیرہن تک وصل میں حائل
نہ زیور جوتری سرگوشیوں میں غل سے حارج ہو

گویا بقول نظیر اکبرآبادی:۔

دل ان کے تارستاروں کے تن ان کے طبل طمانچے ہیں
منہ چنگ زباں، دل سارنگی یا گھنگرو ہاتھ کمانچے ہیں
بن تاروں تار ملاتے ہیں تب نرت نرالا کرتے ہیں
بن ہاتھوں بھاؤ بتاتے ہیں بن پاؤں کھڑے گت بھرتے ہیں
جس گت پر ان کا پاؤں پڑا اس گت کی چال نرالی ہے
جس محفل میں وہ ناچے ہیں وہ محفل سب سے خالی ہے
ہیں راگ ان ہی کے رنگ بھرے اور بھاؤ ان ہی کے سانچے ہیں
جو بے گت بے سرتال ہوئے بن تال پکھاوج ناچے ہیں

یا کہتے ہیں، ''عالم ایک باغ ہے جس میں میری ہستی ایک آرزو مند پھول سے مشابہ ہے۔

اس ذرا سے پھول کو پھر کر قبول
شاخ سے چن لینے میں مت دیر کر
ورنہ مجھ کو خوف ہے اے گلعذار
خشک ہو یہ خاک میں مل جائے گا

گو پریدہ رنگ ہے اور بونحیف
رحم کر اور توڑ لے قبل از غروب
وقت ہے باقی عبادت کا ہنوز
بتکدے میں کردے دیول پر نثار

ٹیگور کا علم الاخلاق اپنشدوں کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اپنشدوں کی تعلیم روحانیت کی تائید اور مادیت کے بطلان میں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ روحانیت کیا ہے اور مادیت کیا ہے۔

گیتان جلی کے مترجم نے اپنے دیباچے میں نئی روشنی کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو ترک روحانیت پر بجا ملامت کی ہے اور ان کی مغربیت کو جو ایک انجذاب گدایانہ اور تقلید غلامانہ ہے، قابل نفریں جنون اور دیوانگی سے تعبیر کیا ہے لیکن ان کی تحریر واضح اور عیاں نہیں ہے اور ان کے مافی الضمیر سے کافی اطلاع نہیں دیتی۔ اپنشدوں کے روحانی فلسفے کے متعلق اکثر ہندو مفسرین اس مغالطے میں پڑ گئے ہیں کہ وہ دنیا کو محض مایا تصور کرتے ہیں اور صرف ترک دنیا کو "نروان" حاصل کرنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ اس مغالطے سے رہبانیت کا خیال ہندوؤں کے اعتقاد میں راسخ ہو گیا ہے اور حیات ملکی اور ملی بجائے جہد للبقا میں صرف ہونے کے منتشر اور ضائع ہوتی

ہے۔ مسلمان بھی لفظ روحانیت کو بے محل استغناء کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ٹیگور کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں؛ ٹیگور کا مذہب جبر یہ نہیں بلکہ قدر یہ ہے: وہ اپنی کتاب الاخلاق ''سادھنا'' میں کہتے ہیں، ''ماسوا کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے انسان نوامیس الہیہ اور قوانین قدرت کا ضرور مطیع ہے لیکن بالذات 'انا' قطعاً آزاد ہے''۔

سری کرشن مہاراج نے جو یہ فرمایا ہے کہ ''میں افعال سے بالا ہوں، ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کامل بشر بیکار اور بیشل زندگی بسر کرتا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ جہادِ زندگی اور تنازع للحیات میں کامیابی اور ناکامی کے خیال سے آزاد ہو کر بے لوث کوشش کرنی چاہیئے۔

ٹیگور ''سادھنا'' میں بیان کرتے ہیں، ''زندگی کی خوشی کام میں ہے؛ کام میں ایک عجیب لذت ہے؛ یہ لذت تکمیلِ حیات میں مدومعاون ہے۔ کوئی ذی حیات اس قدر محنت اور مشقت نہیں کرتا جس قدر انسان اور یہی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے۔ زندگی تغیرات باطنہ کو تغیرات خارجہ سے مماثل اور مناسب کرنے پر منحصر ہے۔ ہمارے ممالک میں لوگ حصولِ طاقت اور حصولِ وسعت کے روحانی اصولوں کو بھول گئے ہیں: لوگ ''برھما'' سے صرف مراقبے سے معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور

عالم کون و فساد میں جہاں اس کی ذات ذرہ ذرہ میں مصروف جہد ہے اس کو دیکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس یک طرفہ کیفیت سے ہندوستان کے مزاج میں ایک مجذوبیت پیدا ہوگئی ہے جس نے ہمیں دین اور دنیا دونوں سے کھو دیا ہے۔ اگر کوئی شخص گیتان جلی کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ٹیگور کی تعلیم اعتکاف نشینی اور چلہ کشی ہے تو اس سے زیادہ کوئی اور غلطی ممکن نہیں۔ صومعہ نشینی گناہ ہے کیونکہ معرفت الٰہی کام میں ہے آرام میں نہیں۔ جو زن و فرزند فرائض زندگی اور علائق دنیا سے بھاگتا ہے وہ خود خدا سے بھاگتا ہے، چنانچہ گیتان جلی میں کہتے ہیں، ''یہ عبادت نغمہ و سرود یہ تسبیح خوانی چھوڑ' دروازہ بند کر کے خانقاہ کے سنسان اور تاریک گوشے میں تو کس کی پرستش کر رہا ہے؟ آنکھیں کھول، دیکھ تیرا خدا تیرے روبرو نہیں وہ تو وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین میں ہل چلا رہا ہے، جہاں سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے؛ وہ تو ان کے ساتھ دھوپ اور بارش میں ہے اس کا ملبوس خاک سے اٹا ہوا ہے۔ یہ خرقۂ سالوس اتار کر پھینک دے اور اس کی طرح خاکِ زمین پر اتر آ۔ زاہدانہ یا فلسفیانہ گوشہ نشینی ایک ابدی قبر ہے، آزاد وہ ہیں جو بنی نوع کو ظالمانہ قیود سے آزاد کرتے ہیں، جو حریت کے علَم بردار ہیں، جن کا لقب فاتح ہے جن کو خدا نے اپنی تیغ جوہردار عطا کی ہے۔

میرا خیال تھا کہ میں تجھ سے وہ گلاب کا ہار مانگوں گی جو تیری گردن میں ہے لیکن ہمت نہ ہوئی۔ بالآخر صبح کی منتظر رہی کہ جب تو جانے لگے گا تو بستر پر چند اجزاءاس کے رہ جائیں گے، لےلوں گی۔ ایک بھکارن لڑکی کی طرح میں نے صبح کو تلاش کی کہ ایک دو ہی پریشان پنکھڑیاں مل جائیں لیکن مجھے کیا ملا؟ تیری محبت کی کون سی نشانی میں نے پائی؟ نہ وہ پھول ہے نہ کوئی خوشبودار مسالا، نہ کوئی عطر کا ظرف''۔ ....''وہ تیری زبردست تلوار ہے، شعلہ کی طرح چمکدار اور گُرز کی طرح وزنی، وہ تیری خوفناک تلوار ہے''۔ ....''جن کے لئے زندگی ایک روزِ مشقت ہے ان کے لئے موت ایک پرراحت شبِ آرام ہے، شبستاں وصل کا دروازہ ہے۔ پھول گوندھ لئے گئے ہیں، ہار دولہا کے لئے تیار ہے، شادی کے بعد دلہن اپنا گھر چھوڑ دے گی اور اپنے مالک سے تنہارات کے سناٹے میں ملے گی''۔

☆☆☆☆☆☆☆

لندن

ہندوستان سے انگلستان جانے والوں کی تعداد روز افزوں ہے اور بہت سے اصحاب کے لئے اب وہاں کے حالات ذاتی مشاہدات اور تجربات میں داخل ہیں۔ تاہم ہر سیاح کے مشاہدات ایسے ملک کی نسبت جو اس وقت رونق اور ترقی کا مرکز ہے اپنا خاص لطف رکھتے ہیں۔ ذیل میں ایک مضمون درج کیا جاتا ہے جو عبدالرحمٰن بجنوری نے لندن کے متعلق اپنے والد کو غالباً ۱۹۱۰ء میں تحریر کیا تھا۔

حدود اربعہ اور آب وہوا

لندن ایک از حد وسیع اور غدار شہر ہے۔ اس کی اصلی وسعت کا اندازہ ہندوستان کے کسی شہر سے نہیں کیا جا سکتا۔ دلی اور علی گڑھ لندن کے چند گلی کوچے ہیں۔

شہر مختلف اضلاع میں منقسم ہے اور ہر ضلع گویا ایک علیٰحدہ شہر ہے پس لندن کے ایک حصے سے دوسرے تک پہنچنے کے لئے وہی وسائل ضروری ہیں جو ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانے کے لئے لازمی ہیں۔

میری تعلیم گاہ اور فرودگاہ میں باوجود زیادہ بُعد نہ ہونے کے بارہ

میل کا فصل تھا۔ پس ظاہر ہے کہ جب تک زمین کی طنابیں نہ کھنچ جائیں ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے کے لئے کتنا وقت چاہئے۔ اس مشکل کو زمین دوز ریلوں نے حل کر دیا ہے۔

تمام لندن کی سرزمین کے نیچے زمیں دوز راستے ہیں جن پر ہر دومنٹ کے فاصلے سے ایک اسٹیشن بنا ہوا ہے۔ ان زیر زمین اسٹیشنوں میں مسافر لفٹ کے ذریعہ نیچے آتے ہیں اور ریل پر سوار ہو کر جہاں ضرورت ہو جا سکتے ہیں۔ غرضیکہ شہر کے زیر زمین حصہ میں یہ ریلیں جسم میں شریانوں کی مثال شب و روز رواں دواں ہیں۔

سطح زمین پر ٹرام برقی ہر مقام سے ہر مقام کو جاتی ہے۔ اس کی وضع بالکل بمبئی کی ٹرام سے مشابہ ہے۔ لاتعداد ہر وقت ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتی رہتی ہیں۔

ایک قسم کی بس موٹر گاڑیاں بھی ہیں۔ یہ بھاپ سے چلتی ہیں۔ انکی تعداد بھی کثیر ہے۔

علاوہ بریں ٹیکسی موٹر کار ہیں۔ جہاں دیکھئے قطاروں کی قطاریں سڑک کے وسط میں استادہ ہیں۔ ان میں یہ انتظام ہے کہ میٹر کے ذریعہ کرایہ خود بخود تحریر ہوتا رہتا ہے اور اسی حساب سے دینا پڑتا ہے۔

گھوڑا گاڑیاں جس طرح ہندوستان میں یکہ کی مثال معدوم ہورہی ہیں یہاں بھی کم ہیں۔مگر ہنوز بکثرت موجود ہیں۔

باوجود اس کے یہ ذرائع ضروریات کے لحاظ سے محض ناکافی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آمدورفت کے مسئلہ کو کس طور حل کیا جائے۔

آب وہوا میں یہ شہر کوئٹہ سے مشابہ ہے۔گو برف باری کے زمانہ میں سردی زیادہ ہوتی ہے۔ بالعموم ترشح ہونے کے باعث ابر ہمیشہ محیط رہتا ہے۔ اور آفتاب کی صورت ہفتوں نظر نہیں آتی۔ بارہا صبح سے شام تک چراغ اور فانوس روشن رہتے ہیں۔ یہاں کی کہر ایک بلائے عظیم ہے۔جس کا اندازہ مشکل ہے۔ جب کہر چھا جاتی ہے تو پھر ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔شعلہ پردہ فانوس سے باہر نہیں آسکتا۔تمام آمدورفت بند ہو جاتی ہے۔ اور لوگ قریب ترین مامن میں پناہ لیتے ہیں۔مگر ایسی کہر ایک شاذ چیز ہے اور صرف ایک بار میرے تجربے میں آئی ہے۔

یہ لندن کا مختصر جغرافیہ ہے۔

آزادی اور حکومت

عظمتِ برطانیہ حقیقت میں یہاں آکر معلوم ہوتی ہے۔زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ نظم حکومت کے قواعد اس قدر تبدیل ہوگئے ہیں کہ

ہندوستان یا ایشیا کے رہنے والوں کو ان کا ذہن نشین کرنا از حد مشکل ہے۔

اگر کوئی یہ دریافت کرے کہ اس تہذیب وتمدن کا سب سے شیریں ثمر کیا ہے تو میں یہ کہوں گا ''آزادی''۔

اور اگر مجھ سے یہ دریافت کیا جائے کہ آزاد ملک کی کیا تعریف ہے تو میں یہ جواب دوں گا

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد　　　کسے رابا کسے کارے نباشد

ارسطو کا قول ہے کہ عدم مساوات سے زیادہ کوئی شے قوموں کو پژمردہ اور مغلوب نہیں کرتی۔ اور چونکہ ایشیا صدیوں تک مطلق العنان حکومتوں کی خلافت گاہ رہا ہے۔ اہل ایشیا لفظ آزادی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔

ہے یہ　وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

آزادی کے معنی وہی ہیں جو خلفائے راشدین کی حکومتِ جلیلہ میں تھے۔ جب کہ ایک ادنیٰ شخص خلیفہ وقت کو غلطی سے روک سکتا تھا۔ اور ایک ذمی یہودی امیر المومنین کے خلاف انصاف کا طالب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہاں ہر امیر اور ہر فقیر، مفلس اور تونگر شہری ہونے کی حیثیت سے ہم پایہ ہیں۔ ہر شخص اپنا فرض ادا کرنے اور منصب بجالانے تک پابند ہے اس سے

زیادہ اس پر کوئی قید نہیں۔ ملازم کو آقا سے خائف ہونے کی اور ماتحت کو افسر کی سفارش کی کوئی حاجت نہیں۔ کوئی حاکم بالا دست اپنے محکوم سے بیجا باز پرس نہیں کر سکتا اور کوئی آقا ملازم پر دستِ تعدی دراز نہیں کر سکتا۔ قانون نے میزان عدل میں تول کر جو حقوق تفویض کر دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی کی حالت میں عدالت چارہ دہ ہے اور کسی کو ایسی جرأت نہیں ہو سکتی کہ انصاف کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔

جب سرِ راہ پولیس کا سپاہی اپنی ایک انگلی سے منع کر دیتا ہے تو عوام کیا خواص خواہ سر پر قیامت ہی کیوں نہ آئے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اور وہ ادنیٰ ملازم حکومت خود اس قدر پابند قانون اور آگاہ فرائض ہے کہ ضعیف عورتوں، اپاہج اور معذور لوگوں اور معصوم بچوں کو خود ایک جانب سے سڑک کی دوسری جانب تک بحفاظت پہنچا دیتا ہے۔ اور راستہ بھولے ہوئے کو خضر بن کر منزل کا پتہ اور نشان دیتا ہے۔ اور ہر وقت ہر معاملے میں مدد دیتا ہے۔

ہر شخص کی حکومت اس کے دفتر تک محدود ہے۔ اس کے بعد کوئی کسی کا حاکم نہیں۔

مگر خلفائے راشدین کی حکومت اور اس میں یہ امتیاز ہے کہ اسکی

رحمت عام تھی۔ اور اس کی برکت انگلستان کے اندر محدود ہے۔

تمدّن

جہاں یہ لوگ قانوناً اس قدر آزاد ہیں تمدن کی زنجیروں سے اس قدر بستہ ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے۔ بارِ حکومت جہاں اس قدر کم ہے وہیں بارِ علائق اس قدر زیادہ ہے کہ شاید اس سے زیادہ سرگرداں قوم اور نہ ہو۔ ان قواعد اور آداب و رسومات کی بنیاد یہ ہے کہ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے زندگی میں ایک قرینہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس تعدیل سے ایک قومی حسن نکلتا ہے۔ جو اس تہذیب کا معیار یا مثالیہ ہے۔ حسن پرستی اور حسن آرائی میں اہل یورپ فی زمانہ قدیم یونانیوں کے جانشین ہیں۔

کوئی شخص رختِ خواب میں کمرے سے باہر نہیں آسکتا۔ کوئی شخص جو ازسرتاپا پورا لباس نہ پہنے ہوئے اپنے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔

لباس کا فیشن سے مطابق ہونا ضروری ہے۔

اُمرا کی زندگی کا منشا اور مدعا فیشن کا مطالعہ ہے۔

ہر تماشا گاہ، ہر قہوہ خانہ میں شریف لوگوں کے کمرے میں بیٹھنے کے لئے شب کے وقت لباسِ طعام ضروری ہے۔

قانون کے خلاف جرم کرنا سوسائٹی کی نگاہ میں ایسا معیوب نہیں جتنا

آدابِ محفل کے خلاف ذرا سی غلطی کا ارتکاب ہے۔

اخلاق

اخلاق میں یہ لوگ نمونہ ہیں۔ ملازموں کی مستعدی اور فرمانبرداری بیان سے باہر ہے۔ اپنا فرضِ منصبی بجالانے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ دکانوں اور قہوہ خانوں کے ملازمین مرد اور عورتیں اس خوبی اور خوش کلامی سے اپنا کام کرتے ہیں کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی سلیقہ شعاری اور مستعدی کو تجارت کے فروغ میں بڑا دخل ہے۔

جس شخص سے راستہ دریافت کیجئے، بچہ اور بڑا اپنا کام حرج کرنے اور ہمراہ جانے کے لئے تیار ہے۔ اگر کوئی شے گرجائے تو ہر شخص کوشش سے تلاش کے بعد آپ کو پہنچادے گا۔

اعتبار

قومی اعتبار اس درجہ ہے کہ بہت سی چیزوں میں نہ رقعہ ہے نہ رسید مگر کسی قسم کے دھوکہ کا احتمال نہیں۔ تمام لندن' کیا مکانات اور کیا دکانیں ایک شیشہ خانہ ہے۔ دکانیں تمام کھلی ہوئی ہیں صرف شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ مکان سامنے سے صرف شیشوں کی کھڑکیوں سے بند ہیں جن کے سامنے کوئی لوہے کی سلاخیں یا محافظت نہیں۔ اتوار کے روز کوئی اپنے گھر

سے دکان نہیں جاتا۔ تمام کاروبار بند رہتا ہے۔ مگر کیا مجال کہ کوئی شخص جرأت کر کے ان کمزور شیشوں کے پیچھے سے ایک پائی کی چیز اٹھائے۔ جوہری بازار میں ایک شیشے کے پیچھے اتنا مال ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کی کسی ریاست کی فروخت سے روپیہ جمع کیا جائے تو اس کا نصف ہو۔

عیش

مگر تعیش کا رنگ غالب ہے۔ شراب خانے شب و روز معمور ہیں۔ تماشہ گاہوں میں چھ چھ ماہ آئندہ تک کے ٹکٹ فروخت ہو چکے ہیں۔ کشتی۔ دنگل۔ سرکس وغیرہ کو کم پوچھا جاتا ہے۔ ناٹک کی قدر زیادہ ہے اور ان سے بھی زیادہ رقص خانے آباد ہیں۔

اس کی سب سے اہم وجہ لامذہبی ہے یعنی لوگوں کے دلوں سے معصیت کا خیال محو ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کا یہ خیال ہے کہ اس زندگی کے بعد کچھ نہیں۔ نہ کوئی جواب دہی ہے۔ نہ عدالت۔ جو کچھ عیش و عشرت ہو سکے یہیں کیجئے۔

سیاسی اعتبار سے مذہب ابھی زندہ ہے۔ اور کلیسا ہماری مساجد سے بظاہر زیادہ آباد ہیں۔

اجتماع سعدین

یہاں کے لوگوں میں علم اور دولت دونوں مجتمع ہیں۔ دولت یہاں کی بے اندازہ ہے اس کا خیال بھی ہمارے حیّز امکان سے باہر ہے۔ یہاں ایک گذارہ کرنے والے آدمی کا ذاتی خرچ بکفایت دس پونڈ ہے اور جس خاندان میں چار آدمی مع بچوں کے ہوں اور ۳۰ پونڈ آمدنی ہو وہ خاندان غریب ہے۔ یہاں کے غربا ہمارے سفید پوش شرفا سے بہتر حالت میں ہیں۔ عظیم الشان عمارت کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ اور ایک ہوٹل کی قیمت ہماری ایک بستی سے زائد ہے۔ ہر قہوہ خانہ ایک بہارستان ہے۔

سڑکیں از حد وسیع اور کشادہ ہیں اور دونوں جانب پیادہ چلنے کے راستے ہیں۔

اس لاتعداد دولت کے اجتماع کا باعث تجارت ہے۔ یہاں تاجر سے بڑھ کر کوئی شخص صاحبِ جاہ نہیں۔ ہر سال تاجروں میں سے ایک شخص شہر لندن کا میئر یعنی افسرِ اعلیٰ مقرر کیا جاتا ہے۔ دکانوں کا طول و عرض بیان سے باہر ہے۔ بڑی دکانوں کی محض سیر کرنے کے لئے ایک ہفتہ درکار ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو یہاں مہیا نہ ہو۔

جو مانگئے زمانہ ہے حاضر لئے ہوئے

غرض لندن ایک عجیب وغریب مقام ہے جہاں بے پناہ دولت جمع ہے۔ جو جملہ فنون کا مخزن ہے۔ جو سب سے بڑی سلطنت کا پایہ تخت ہے۔ جہاں ان عجائبات دنیا کا دیکھنا تعجب اور رشک کا باعث ہے وہیں انسان سوسائٹی کی اندرونی حالت کو دیکھ کر تاسف کرتا ہے۔ نوجوانوں کے لئے مقام امتحان وآزمائش ہے۔ جب تک کہ اپنے وطن اور تہذیب کو یاد رکھے محفوظ ہے۔

اس ترقی سے اگر اپنے تنزل کا مقابلہ کیا جائے تو مولانا حالی مدظلہ کا وہ قول یاد آتا ہے جہاں ایک پیر دانا کے یہ کہنے پر کہ جس قوم میں عقل، علم یا دولت میں سے کوئی شے موجود نہ ہو اس پر بجلی گرنا بہتر ہے آپ نے فرمایا ہے:۔

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو
مبادا کہ وہ ننگِ عالم تمہیں ہو

☆☆☆☆☆☆☆

سیر لکھنؤ

لکھنؤ میں جہاں اور چیزیں قابل دید ہیں، چند تصویریں بھی ہیں۔

تصویریں کیا ہیں گویا شاہان و وزیران اودھ کی تاریخ کے چند اوراق ہیں جو زمانے کی دستبرد سے بچ رہے ہیں، یایوں کہئے کہ اس کارواں کے نقش پا ہیں جو اودھ کی خاک پاک سے آج نصف صدی گزری اپنا کوچ ختم کر کے چلا گیا ہے اور جس نے اس دنیا کو خیر باد کہہ کر اس سرزمین کو آباد کیا ہے جہاں حیات انسانی ابدی ہے۔

دروازہ کھلا، ہم داخل ہوئے، دس وزیران و شاہان اودھ ایک کمرے میں! قانون قدرت کے خلاف ہے کہ سعادت خان شاہ اول اور واجد علیؔ شاہِ آخر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوں، مگر یہ تو تصویریں ہیں۔۔۔۔۔ پہلی تصویر سعادت خاں کی ہے جو ہو بہو اورنگ زیب کی تصویر ہے، عجب بات ہے کہ دو انسانوں کی شکل ایک مگر زندگی جدا، ایک سے ایک سلطنت شروع ہو دوسرے پر دوسری ختم ہو، تصویر میں پشت کی جانب قطب مینار ہے، شاید خاندان اودھ اور شاہان دہلی کے تعلقات کی طرف اشارہ ہو۔ کیا عبرت کی بات ہے! قطب صاحب کی لاٹ آج تک قائم ہے، سعادت خاں کے خاندان کا چراغ گل ہو گیا۔ نسل انسان کو اتنی بھی بقا

نہیں جتنی پتھروں کے ایک باقاعدہ ڈھیر کو۔

آگے بڑھئے یہ نواب منور جنگ کی تصویر ہے، باپ سے مشابہ ہے۔ رنگ ذرا سیاہ ہے شاید مصور کی عنایت ہو، خنجر کمر سے کھول دیا ہے؛ غالباً استحکام سلطنت کی وجہ سے اسکی ضرورت نہ رہی ہو، پشت کی طرف چھتر منزل ہے، اس منزل کو آپ ہی نے بنوایا تھا مگر یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ ایک دن انگریزی کلب میں تبدیل ہو جائے گی۔

بڑے آدمیوں کی تیسری پشت میں اکثر قابل آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ لوگ ایسا ہی کہتے ہیں، شاید سچ بھی ہے۔ تیسری تصویر شجاع الدولہ کی ہے، شجاعت جس کے نام سے عیاں ہے، باپ دادا کی پوشاک کو خیرآباد کہہ دی ہے، برجس پہنے گیٹس چڑھائے شمشیر بکف کھڑا ہے، داڑھی صاف ہے، مونچھیں بڑھی ہوئی ہیں، پیشانی پر بل ہیں، آنکھیں غضبناک ہیں، گویا دیکھ رہی ہیں کہ میرا ملک غیروں کے ہاتھ میں ہے۔ لوگ کہتے ہیں بڑا مشہور جنرل ہے مگر مجھے تو سیدھا سادھا سپاہی معلوم ہوتا ہے جو شرابِ حب وطن سے مخمور، زرہ میں مستور کھڑا ہے، واقعی یہ شخص شیر ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ اُس وقت شیر اصلی ہوگا اور اب شیر کی تصویر رہ گیا ہے۔

لکھنؤ میں آج تک جب دکان دار اپنی دکان کھولتا ہے تو آصف الدولہ

کا نام لیتا ہے۔ یہ اپنے خاندان کا لکھ داتا ہے اگرچہ کوئی بڑا انجینئر نہیں مگر امام باڑہ آصف الدولہ کے بنوانے کی وجہ سے لکھنؤ کا شاہجہاں مشہور ہے۔

ہم اسکی تصویر کے سامنے کھڑے ہیں، بھاری بھرکم آدمی ہے، لباس ایک ہندوستانی دولہا کے لباس سے مشابہ ہے اور کیوں نہ ہو لکھنؤ دلہن تھی اور یہ اسکا دولہا، پاجامہ ڈھیلا ڈھالا سرخ ریشم کا ہے، پاؤں میں گھیتلا ہے جس کو اب مستورات بھی نہیں پہنتیں کیوں کہ اس سے چلنے میں دقت ہوتی ہے، سر پر کلغی ہے اور پھبتی بھی ہے۔

اس سے اگلی تصویر سعادت علی خاں کی ہے، وہ طاقت جو باپ کے دل میں تھی بیٹے کے دماغ میں منتقل ہوگئی ہے، باپ سخی تھا بیٹا مدبر ہے۔

اب تک جتنے تھے کھڑے تھے، سعادت خاں صوبہ قائم کرنے کی فکر میں، بیٹا اپنے باپ کی پیروی میں' شجاع الدولہ اپنی تلوار کے بھروسہ پر، آصف الدولہ دولت دینے اور دعائیں لینے کے لئے مگر سعادت علی خاں سوچنے کے لئے بیٹھ گیا ہے۔ دوہرے بدن کا آدمی ہے، چہرے سے رعب برستا ہے نہایت کم سخن اور سمجھدار معلوم ہوتا ہے، اعضا میں ایک خاص تناسب ہے جو دل کو لبھائے لیتا ہے، غرض مکمل انسان ہے، حسن ظاہری اور باطنی دونوں موجود ہیں۔ یاد پڑتا ہے کہ میں نے اسی شباہت کی ایک اور تصویر

دیکھی ہے، ہاں یاد آیا۔ سر سالار جنگ مرحوم سے بہت ملتا ہے۔ دونوں اپنے وقت کے مدبر ہیں اور دونوں کی زندگی ایک گونہ ناکامی کی جھلک لئے ہوئے ہے۔ سعادت خاں اور اورنگ زیب کی ایک شکل مگر زندگی میں اختلاف۔ سعادت علی خاں اور سر سالار جنگ کی ایک شکل اور زندگی میں ایک گونہ یگانگت، ایسی باتیں ہیں جو ہم نہیں سمجھ سکتے۔

باپ نے بیٹے کے سر پر تاج رکھ دیا مگر تاج کے آتے ہی شان جاتی رہی۔ غازی الدین حیدر خوبصورت بھی باپ کی طرح ہے، لباس بھی وہی ہے بلکہ شاہی عبا کی زیادتی ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ طرّہ کی جگہ تاج ہے۔ پھر اس خیال کے آنے کی کیا وجہ؟ آنکھوں میں تدبیر کی نظر کی بجائے شوق کی نگاہ ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ باطن کی آنکھیں بند ہوگئی ہیں۔ خیر آگے بڑھیے۔

نصیر الدین حیدر کی تصویر نے اس خیال کو اور بھی تقویت دی۔ دبلا پتلا آدمی ہے، صورت میں باپ دادا سے مختلف، آنکھیں عیاشی کا پتہ دے رہی ہیں، چہرے پر ایک خاص نقاہت اور رنگ میں ایک خاص سیاہی ہے جو ثابت کرتی ہے کہ صرف اس کی ہی عیش پرستی نے اس کو اس حالت پر نہیں پہنچایا بلکہ باپ دادا کی عیاشی بھی شامل ہے۔ دنیا بھی عجیب جگہ ہے، گناہ کرے کوئی اور پاداش اٹھائے کوئی مگر صرف سمجھ کا پھیر ہے۔ اگر وہ ظاہر کا

پردہ جو باطن کو چھپائے ہوئے ہے اٹھا دیا جائے تو 'میں' اور 'تو' میں فرق ہی کیا رہ جائے؟ اور جب یہ ہے تو سب کا گناہ اپنا گناہ اور اپنا گناہ سب کا گناہ ہے، کیونکہ آخر ہم سب ایک ہی منزل کی طرف تو بڑھ رہے ہیں۔

اگلی تصویر محمد علی شاہ کی ہے۔ یہ غازی الدین حیدر کا بھائی اور سعادت علی خاں کا بیٹا ہے۔ آدمی سیاہ فام ہے مگر یہ سیاہی وہ نہیں جو پہلی تصویر میں دیکھی تھی، وہ باطن کی ایک جھلک تھی جسکا وہ خود قصوروار تھا یہ ظاہری ہے جس کی قدرت ذمہ دار ہے مگر قدرت تو غلطی نہیں کرتی۔ آنکھوں کی تیزی گواہی دیتی ہے کہ اپنے گردوپیش سے خبردار ہے مگر افسوس! وہ آنکھیں جن سے کوئی چیز چھپی نہیں رہتی تھی، موت کو جو قریب ہی گھات میں لگی ہوئی تھی نہ دیکھ سکیں۔ تخت پر بیٹھنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ تخت و تاج جس کے لئے اس قدر انتظار کھینچا تھا یکایک چھوڑنا پڑا۔ پانچ سال حکومت کر کے تاج و تخت سے رخصت ہوا اور اس آسمانی سلطنت میں داخل ہوا جہاں حکومت ہے اور زوال نہیں، جہاں شجاعت ہے اور جنگ نہیں، جہاں عیش ہے اور گناہ نہیں۔

یہ امجد علی شاہ ہے۔ دیکھتے ہی ہم نے سعادت علی خاں کی تصویر پر مڑ کر نگاہ ڈالی، واقعی دادا کی شباہت آتی ہے، خاندان اودھ کے چراغ نے

بجھنے سے پہلے ایک خاص روشنی دکھلائی تھی جس نے بہت سے دلوں میں امید کی شمع کو روشن کردیا تھا۔ امجد علی شاہ سے لوگوں کو بہت سی امیدیں تھیں مگر خاندان اودھ کا انجام قریب آگیا تھا۔ موت نے اسے بھی مہلت نہ دی۔ محمد علی شاہ تو بوڑھا تھا، اِس بیچارے نے کیا قصور کیا تھا؟ مگر موت وقت نہیں دیکھتی۔

اس کے بعد کی تصویر پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں جس کی تصویر ہے۔ مگر چونکہ ایک باریک حجاب نظر کا مانع ہے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ہماری آنکھیں جو ایک باریک حجاب سے گزر کر اس چیز کو نہیں دیکھ سکتیں جسے ہم دیکھنا چاہتے ہیں کیوں اس راز کو دریافت کرنے کا شوق رکھتی ہیں جو پردۂ قدرت میں پنہاں ہے؟ یہ سچ ہے مگر چشم باطن کی نگاہ تو خیال سے وسیع اور موجودات سے بالاتر ہے۔

پردہ اٹھا تو ہم نے دیکھا کہ اس تصویر میں اور، اَور تصویروں میں ایک خاص فرق ہے۔ یہ تصویر نفاست اور زیبائش میں ان سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی اور غالباً بنگالی مصور کی بنائی ہوئی ہے۔

یہ واجد علی شاہ کی شبیہ ہے جو عیاشی کی مجسم تصویر تھا۔ کام دار اچکن

پہنے ہوئے ہے، سر پر دو کلیہ مرصّع کلغی دار ٹوپی ہے۔ سینے کا کچھ حصہ باہر نظر آرہا ہے، کیسا خوبصورت آدمی ہے، افسوس! اگر اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا تو کیسا اچھا ہوتا آہ! ظاہر سفید باطن سیاہ! مگر یہ شکایت خاص اس سے کیوں، ہر انسان کا یہی حال ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

میل جول

انسان کے آپس کے میل جول پر ایک کتاب مختلف پہلوؤں سے لکھی جاسکتی ہے۔ منجملہ ان پہلوؤں کے ایک پہلو سائنٹیفک پہلو بھی ہوسکتا ہے جس میں یہ خصوصیت ہے کہ ان قدرتی قوانین کی زیادہ توضیح ممکن ہے جن کی پابندی انسانی میل جول میں ہونی چاہئے۔ اگر ہمیں پختہ طور پر معلوم ہوتا کہ قوانین کیا ہیں تو ہم بآسانی اس امر کی پیشین گوئی کر سکتے کہ اس مزاج کے آدمی آپس میں راہ و رسم خوشی سے رکھیں گے اور اس طبیعت کے ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں گے۔ اس صورت میں انسانی میل جول ایسی ہی یقینی سائنس ہوتی جیسی کہ کیمسٹری۔ جس میں ہم نہایت وثوق اور درستی کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ ان اشیاء کو یکجا کرنے سے یہ نتیجہ پیدا ہوگا۔ بعض حالتوں میں اس سائنٹفک حد کے قریب قریب پہنچنا ممکن بھی ہے مثلاً جب ہم دو آدمیوں کی خصوصیت سے بخوبی واقف ہوں تو ہم کسی حد تک درستی کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ ان میں آپس میں نہ نبھے گی۔

بعض دور بین اشخاص افراد کے باہمی میل جول کے ساتھ بہت صحت کے ساتھ رائے زنی کر سکتے ہیں۔ مگر بس یہیں ان کی دانائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے وہ ان مختلف مثالوں سے کوئی عام قاعدہ یا قانون نہیں بنا سکتے۔

جن پر دیگر قوانین قدرت کی طرح عمل درآمد کیا جا سکے۔ اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس قسم کے قانون قوانین قدرت میں سے نہیں بلکہ انکی ایک ناقابل اعتبار اور بھدی نقل ہیں۔

اس مشکل کے پیش آنے کی وجہ یہ ہے کہ انسانی طبائع بے حد مختلف ہیں اور اسی اختلاف کا باعث ہے کہ جس آدمی کو پہلے سے نہیں جانتے اور جس کی عادات و اطوار کے مطالعہ کا ہمیں موقع نہیں ملا تو اس کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کی نسبت جن کے حالات سے ہمیں کچھ بھی واقفیت نہیں ہم کسی قدر غلط رائے قائم کر سکتے ہیں اور یہ دریافت کرنا ہمارے لئے کسی قدر مشکل ہے کہ وہ کس قسم کے آدمیوں کو اپنا دوست بنائیں گے۔

انسانی میل جول کے متعلق بعض خیالات جو عوام میں مشہور ہیں خالی از دلچسپی نہیں۔ مثلاً عام طور پر مانا جاتا ہے کہ بے تکلف دوست ہونے کیلئے دونوں کو ایک ہی فرقے اور قریب قریب ایک ہی حیثیت کا ہونا چاہئے مگر جب ہم واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سی مثالیں اسکے بالکل برعکس نظر آتی ہیں۔ ایک اور خیال یہ ہے کہ آپس میں میل جول بڑھانے کی وجہ ایک خاص بات میں دونوں اشخاص کا دل چسپی لینا ہوا کرتی ہے۔ میرے

خیال میں بہت سی مثالیں ایسی دیکھنے میں آتی ہیں کہ ایک بات میں دلچسپی لینا دوستی کے بجائے موجب فساد ہوا ہے۔ البتہ اس وقت تک نبھتی رہتی ہے جب تک طرفین میں سے ایک کسی قدر لاپرواہی برتے۔ جتنی زیادہ دلچسپی ایک بات میں ہوگی اسی نسبت سے اس کے متعلق فروعی چیزیں بھی ہماری نظر میں ضروریات سے بڑھ کر ہونگی۔ مثلاً دو شخص مذہب کے بے حد دلدادہ ہیں ان میں سے ایک مسلمان ہے اور دوسرا عیسائی۔ تو اس حالت میں انکا باہمی میل جول باوجود ایک ہی بات میں دلچسپی لینے کے ناممکن ہے۔ حالانکہ اگر وہ مذہب کے معاملہ میں لاپرواہ ہوتے تو ان کا میل جول دوستی کی حد تک پہنچ سکتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قومیت کا فرق باہمی میل جول کی راہ میں ایک بھاری رکاوٹ ثابت ہوتا ہے مگر نہیں۔ واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قدرتی طور پر ایک قسم کا تعصب ہمارے دل میں غیر قوموں کے لوگوں کے لئے ہوتا ہے۔ اور ہمارا یہ خیال ہوتا ہے کہ ہماری ایک اجنبی شخص کے ساتھ نہیں بن سکتی مگر جب یہ غلط خیال رفع ہو جائے تو اجنبیت وغیرہ سب جاتی رہتی ہے اور اتحاد قائم ہو جاتا ہے۔ البتہ زبان کا اختلاف سدراہ ہوتا ہے۔ مندرجۂ بالا سطور سے صاف ظاہر ہے کہ

باہمی میل جول کے لئے کوئی کلیہ قاعدہ قرار دینا کس قدر مشکل ہے۔ نہ ہم فرقہ ہی ہونا آدمیوں کوایک دوسرے کی طرف راغب کرتا ہے نہ ایک نسل کا ہی ہونا اور نہ کسی ایک خاص بات میں دونوں کا دلچسپی ہی رکھنا۔ البتہ اگر کوئی کلیہ قاعدہ بنایا جاسکتا ہے تو میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ دو آدمیوں کی شخصی خصوصیات میں یگانگت ان کے زیادہ ربط وضبط کا باعث ہوسکتی ہے۔ یہ شخصی اور ذاتی خصوصیت کیا چیز ہے میں نہیں جانتا اور نہ مجھے کسی ایسے دانا آدمی سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جس نے مجھے اسکے متعلق آگاہ کیا ہو۔ یہ شخصی خصوصیت ایک معمہ ہے اور اسکی پیچیدگی ہم پر یہ خوبی واضح ہوجاتی ہے جب ہم اپنے دوستوں میں سے کسی ایک خاص دوست کی طرف زیادہ مائل ہونے کی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہیں اور نہیں کرسکتے۔

میں نے کئی دفعہ اس بات کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنے دوستوں میں سے ایک خاص دوست کی صحبت میں زیادہ لطف کیوں آتا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی خاص بات ایسی نہیں پائی جاتی جو اسے اوروں سے ممتاز کردے۔ میری اسکی عادت بھی کچھ ملتی جلتی نہیں۔ اسکے عیب بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ پھر ایسا ہے تو کیسے معلوم ہو کہ اوروں میں وہ خاص بات نہیں جو میل جول کو دلچسپ بنائے۔ یہ خاص بات کیا ہے میں نہیں بتا سکتا۔

مذاق کی موافقت ایک ایسا فقرہ ہے جو میرا مطلب کسی حد تک ظاہر کرتا ہے۔ مگر اس پر وضاحت سے لکھنا اس لئے مشکل ہے کہ انسانی طبائع کے اختلاف کا آج تک کسی کو پتہ نہیں چلا۔

مذاق کی یگانگت یا ناموافقت دو ایسی طاقتیں ہیں جو باہمی میل جول کو ممکن یا ناممکن بناتی ہیں۔ مگر ان کی وجوہ ایسی پیچیدہ پہیلیاں ہیں کہ جنہیں بوجھنے کے لئے بڑے بڑے بوجھ بجھکڑ سر دھنتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بیوی کا انتخاب

(انگریزی سے ترجمہ)

اماں حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ عورت مرد کی مونس ورفیق ہونے کے لئے بنائی گئی ہے۔ بس یہ رفیقِ طریق جس قدر اچھا ہو اسی قدر مرد کی خوش قسمتی سمجھئے۔ کیونکہ

زنِ نیک خوش سیرت و پارسا
کند مردِ درویش را پادشاہ

یہ بتلا سکنا کہ آیا فلاں شخص شادی کر کے تباہ ہو جائیگا یا سنبھل جائے گا بہت زیادہ اس کی بیوی پر منحصر ہے۔ دنیا میں کوئی چیز ایک زوجہ سے افضل اور نہ ہی کوئی چیز ایک بری بیوی سے بدتر ہے۔

ایک دفعہ امریکہ کے ایک نامور موجد ایڈیسن صاحب کو ان کے ایک دوست نے صلاح دی کہ امور خانہ داری کو جو باوجود نوکروں کی ایک بڑی تعداد کے الجھے پڑے تھے سنوارنے کے لئے شادی کر لیں۔ باوجود نہایت شرمیلے آدمی ہونے کے صاحب موصوف نے اس صلاح کو بہت پسند فرمایا اور کہا کہ کیا تم کوئی ایسی خاتون بتلا سکتے ہو جس کو کہ میں اپنا شریک بنا سکوں۔ دوست نے جواب میں لاپرواہی سے کہا کہ کوئی عورت ہو۔

لیکن ہماری رائے میں کوئی شخص جو ایسی صلاح پر کام کرے واقعی قابلِ رحم ہے۔ کیونکہ جو کچھ کہ دانا لومڑی نے بیمار شیر سے کہا تھا وہی شادی کی نسبت بھی کہا جا سکتا ہے یعنی۔ ''میں دیکھتی ہوں کہ تمھارے غار میں جانوروں کے گھسنے کے نشان ہیں۔ لیکن باہر آنے کے نہیں''۔ کسی کو اپنی زندگی کا رفیق بنانے سے پہلے انتخاب میں نہایت احتیاط برتو۔ کیونکہ ''تب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت''۔ تاہم یہ بتلا دینا بھی مناسب ہے کہ ایک ایسی بیوی کا تلاش کرنا جو بہمہ اوصاف موصوف ہو ایک امید موہوم ہے خواہ وہ متلاشی اپنے آپ مفصلۂ ذیل اشتہار دینے والے کی طرح اس کے شوہر بننے کی قابلیت ہی کیوں نہ پاتا ہو۔

(ایک اخبار میں مفصلۂ ذیل اشتہار چھپا)

ایک نوجوان کو جو ابھی دنیا میں داخل ہوا ہے ایک سترہ سالہ بیوی کی ضرورت ہے۔ جو ذی عصمت۔ تعلیم یافتہ اور کم از کم پانچ ہزار روپیہ ماہوار کی جائیداد کی مالکہ ہو۔ قوی الجثہ اور مضبوط الاعضاء ہو۔ اور قد میں جوتے اتار کر پانچ فٹ چار انچ ہو۔ بہت لحیم و شحیم نہ ہو اور نہ ہی بہت دبلی پتلی ہو۔ حسین ہو اور اپنے حسن پر مغرور نہ ہو۔ باتونی نہ ہو اور نہ ہی ہمیشہ چپ چاپ نظر آتی ہو۔ سخاوت پسند ہو۔ اور قیمتی لباس کی زیادہ شوقین نہ ہو۔ اگرچہ

صاف ستھری رہنے کی عادی ہو۔ شوہر سے دل سے محبت کرنے والی ہو اور اسکے راز کسی سے کہنے والی نہ ہو۔ کفایت شعار بھی ہو اور اگر کوئی مصیبت آپڑے تو اسے خوشی سے سہارنے کی طاقت رکھتی ہو۔ کوئی خاتون جو مذکورہ بالا اوصاف سے متصف ہو اور شادی کی خواہش رکھتی ہو تو (ا۔ب) معرفت (ک۔ش) سے خط و کتابت کرے۔ (نوٹ) درخواست کنندہ کا دعویٰ ہے کہ وہ مذکورہ بالا صفات کی بیوی کا خاوند بننے کی قابلیت رکھتا ہے اور ایسی خاتون کا مستحق ہے۔

بات میں بات نکل آتی ہے وہی کہاوت ہے کہ ایک بوڑھیا نے اپنے نوکر سے کہا کہ میلہ سے ایک گائے جوان اصیل خوبصورت سرخ رنگ۔ مضبوط جسم والی اور بیس روپیہ سے کم قیمت کی خرید لاوے۔ نیز یہ کہ دودھ آٹھ سیر سے کم نہ دیتی ہو۔ نوکر نے ادب سے عرض کیا کہ حضور ایسی گائے کے لئے میلہ میں جانے سے درگاہ رب العالمین میں دعا کرنا بہتر ہے۔

جو لوگ کہ روپے کے لالچ سے امیر خاندانوں میں شادیاں کرتے ہیں وہ دراصل اپنے آپ کو بیوی کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں۔ ہم دراصل انسانی خوشی کا غلط اندازہ کرتے ہیں۔ جو چیز کہ انسان کو خوش بنا سکتی ہے وہ قناعت ہے دولت نہیں۔ ایک شخص جو ایک کروڑ پتی کا مہمان تھا ایک دن

میزبان سے کہنے لگا جناب آپ تو نہایت خوش قسمت آدمی ہوں گے۔اس نے استعجاب سے پوچھا۔خوش۔کیا تمھاری مراد خوشی ہے۔میرے خیال میں تو ہم کو اپنی باتوں کے سلسلہ ہی کو بدل دینا چاہئے۔کسی کا قول ہے کہ جس شخص کی بیوی اپنے ساتھ ایک بہت بڑا جہیز لاتی ہے۔اسکو ہمیشہ ذلت سے دیکھتی ہے اور اس پر سوار ہوتی ہے ایسی بیوی منتخب کر جو اپنی ذات سے تیرے لئے دولت ہو۔نہ کہ ایسی جو اپنے ساتھ دولت لاوے۔ایک شخص نے نہایت فخر یہ کہا کہ ''میری تمام عزت و دولت میرے لئے میری بیوی نے اپنی کفایت شعاری۔خوش خلقی اور لیاقت سے کمائی ہے''۔جس کو سنکر اس کے دوست نے آہ بھری اور کہا کہ ''میری عزت اور دولت سب میری بیوی نے اپنی فضول خرچی۔بدخُلقی اور نالائقی سے ڈبو دی ہے''۔

وہ عورت جو اپنے ساتھ ایک بہت بڑا جہیز لاتی ہے بعض اوقات دنیا کی طرف سے اس قدر لاعلم ہوتی ہے جیسی لوئیس شانزدہم کے دربار کی ایک عورت تھی جس نے یہ سن کر کہ لوگوں کو روٹی نہیں ملتی یہ کہا 'تو پھر وہ کیک بسکٹ کیوں نہیں کھاتے'۔

حسن ظاہری پر فریفتہ ہو کر بھی شادی نہیں کرنی چاہئے۔کیونکہ جیسے دلکش سے دلکش نظارہ ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہنے سے ہیچ معلوم ہونے لگتا

ہے۔ ایسے ہی خوبصورت سے خوبصورت چہرہ بھی اپنی کشش کھو دیتا ہے۔ آج کا حسن کل ایک معمولی چیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حسنِ باطن نہایت سادہ چہرے میں ہمیشہ مانند آفتاب پرتو افگن ہوتا ہے۔ حسنِ باطنی عمر کے ساتھ بڑھتا ہے اور وقت بجائے اس کے کہ حسن ظاہری کی طرح اس کو تباہ کر دے اور جلا دیتا ہے۔ ایک حسین بددماغ عورت کے خاوند سے زیادہ کوئی شخص قابل رحم نہیں۔ تاہم حسن بھرا ہی صحت اور حسنِ باطنی کے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے جو صرف خوش قسمتوں کا حصہ ہے۔

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ بے وقوف عورت سے شادی نہ کرو جو کہ تمھارے راز دوسروں کو بتلا کر تمہیں ہدفِ ملامت بنا دے۔ بیوقوف عورت بجائے خاوند کی مددگار ہونے کے اس کی سدِ راہ ہوتی ہے۔ آدمی کی زندگی بدمزاج عورت سے شادی کر کے بےلطف ہو جاتی ہے مگر بیوقوف کے ساتھ دوبھر ہو جاتی ہے۔

عمر کے بارہ میں یہ کہنا کافی ہے کہ اپنی عقل سے کام لو۔ نہ ہی کسی کم سن سے شادی کرو اور نہ ہی بوڑھی عورت سے۔ کیونکہ شادی کا مقصد ایک دوست کا حاصل کرنا ہے۔ ایک باورچی یا خدمتگار کی تلاش نہیں۔

عورت کے لئے ایک ضروری چیز محنت ہے۔ ایک سست عورت

اپنے نوکروں کو بھی سست بنا دیتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اولاد کو سست بنانے کا موجب ہوتی ہے۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ یہ کیونکر معلوم ہو کہ فلاں عورت محنتی ہے یا نہیں۔ تو یہ کہا جائیگا کہ جس عورت میں ایسی عادات پائی جاتی ہوں اکثر محنتی ہوگی۔ مثلاً صبح خیزی۔ تیز قدمی۔ با اخلاق گفتگو اور لفظوں کا زبان سے صحیح ادا ہونا وغیرہ وغیرہ۔

فلاڈلفیا کے ایک نوجوان کا قصہ ہے کہ وہ ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جس کی دو بہنیں اور تھیں۔ ایک دفعہ جب وہ اس لڑکی کی ملاقات کو گیا تو اس لڑکی نے اپنی دو بہنوں سے آکر دریافت کیا کہ بہنوں معلوم نہیں ہماری سوئی کہاں ہے۔ یہ سنتے ہی وہ شخص فوراً چلا آیا اور پھر کبھی اس لڑکی کا خیال نہیں کیا جو ایک سوئی بھی دو بہنوں کی شرکت میں رکھتی تھی اور پھر بھی نہ جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔

لڑکی کے عادات واطوار سے واقف ہونے کے لئے اسکی ماں اور بہنوں کے مزاج سے آگاہی حاصل کرو کیونکہ اس کا مزاج بھی بہت کچھ ان ہی جیسا ہونا ضروری ہے۔

برن صاحب مشہور شاعر نے عورت کے اوصاف کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں سے چار حصے خوش خلقی کے دو ذکاوت کے ایک

خوبصورتی ۔ایک مذاق اور باقی دو اور تمام اوصاف کے ہیں۔

اکثر اشخاص بیوی کے انتخاب کے وقت یہ دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا وہ خوبصورت۔ امیر اور پڑھی لکھی ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ دریافت کریں کہ وہ سمجھدار محنتی اور محبت کرنے والی ہے یا نہیں۔

ہم اپنے مضمون کو سر جان مور کی رائے پر ختم کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں عورتوں کے گروہ کو سانپوں کے تھیلے سے تشبیہ دونگا جس میں سانپ ہی سانپ ہوں اور صرف دو چار گینڈ مچھلیاں (ایک قسم کی مچھلیاں جو بالکل سانپ سی ہوتی ہیں) اب ہر شخص کو بڑی احتیاط کرنی چاہئے کہ سانپ کے کاٹنے سے محفوظ رہے اور گینڈ مچھلی کو چن لے۔

☆☆☆☆☆☆☆

تحائف زندگی

(خواب)

میں نے ایک بار ایک عورت کو سوتے دیکھا جو عالم رویا میں تھی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ زندگی ایک پری کی شکل میں اس کے سامنے آئی اور کہنے لگی کہ اے عورت! دیکھ میں یہ دو تحفے تیرے واسطے لائی ہوں۔ بائیں ہاتھ میں محبت ہے اور دائیں میں آزادی۔ مانگ کیا مانگتی ہے؟

عورت نے بہت دیر تک تامل کیا اور پھر کہنے لگی۔ آزادی! یہ سن کر پری نے کہا کہ بیشک تو نے اچھا انتخاب کیا۔ اگر تو نے محبت مانگی ہوتی تو میں نے تجھ کو محبت ہی دی ہوتی مگر سن لے کہ پھر میں تجھے چھوڑ کر چلی جاتی اور کبھی واپس نہ آتی۔ میں زندگی ہوں۔ اب تو وہ دن بھی دیکھے گی کہ میں پھر تیرے پاس آؤں گی۔ اور دونوں تحفے ایک ہاتھ میں لاؤں گی۔ اور تجھے دوں گی۔

میں نے دیکھا کہ عورت خواب میں ہنسی۔

(ترجمہ)

مکاتیب

(۱)

بندر مارسیلز،

۲۲ اکتوبر ۱۰ء

جہاز عربیہ

حضور قبلہ وکعبہ ام دام ظلکم العالی

بعد آداب کے گذارش ہے۔نہر سوئیز سے ایک شب و روز کے قریب مسافت پیما ہوکر جہاز بندر سعید پہنچا۔اول صبح سے چار بجے شام تک لنگر ہوااور مسافروں کوشہر دیکھنے کی اجازت ملی۔

بندرگاہ کا نظارہ نہایت اعلیٰ درجے کا ہے اور عجیب خوش منظر ہے۔ سمندر میں جہاز کے نواح میں بیسیوں کشتی والے کشتیاں لئے مسافروں کو ساحل پر لے جانے کے لئے گشت لگا رہے تھے، یہ سب عموماً مصری مسلمان ہیں۔تمام کشتیاں نہایت خوبصورت اور خوش وضع تھیں۔کرایہ ساحل کی آمدورفت کا ۶ پنس (۶ آنہ) مقرر ہے۔

جہاز کے ٹھہرتے ہی بیسیوں سوداگر عجائبات مصر، سگرٹ، ایشیائی ریشم اور طرح طرح کی اشیاء بیچنے جہاز پر آپہنچے اور بہت سے شعبدہ باز،

بازیگر، سازندے اور رقاص بھی آموجود ہوئے۔ ان سب نے تمام وقت ایک عجب ہنگامہ رکھا۔

دس بجے کے قریب شہر دیکھنے گئے۔ ایک بہت چھوٹے نمونے پر بمبئی کا نمونہ ہے مگر زیادہ کشادہ بافصل عمارات ہیں اور ہوا کی آمدورفت کے لئے مانع نہیں۔ طرز عمارت بھی قریباً وہی ہے۔ مغربی حصے میں صفائی خوب ہے مگر مشرقی حصہ کثیف ہے۔ بندرگاہ ہونے کی وجہ سے تجارت کو نہایت فروغ ہے مگر افسوس ہے کہ مصریوں کا اس میں کچھ حصہ نہیں، سب یونانی اور اطالوی لوگ ہیں۔ ان دکانوں میں انگریزی دکانوں کی طرح منہ بولی قیمت نہیں لی جاتی بلکہ سودا ٹھہرانا پڑتا ہے۔ مصریوں کی تجارت البتہ مشرقی حصے میں ہے، وہاں یورپی تجارت کو بہت کم دخل ہے۔

مغربی حصے میں اگر حساب لگایا جائے تو تمام عمارات میں نصف سے زیادہ سگرٹ کے کارخانے یا دکانیں اور ''کیف'' یعنی قہوہ خانے ہیں۔ قہوہ خانوں میں اس قدر رونق رہتی ہے کہ ان کے وقوعات اور شارع پر شب و روز ہجوم رہتا ہے۔ ہر قوم کا آدمی ملتا ہے، ہر زبان بولی جاتی ہے، ہر ملازم ہفت زبان ہے، عجب عجب لباس دیکھنے میں آتے ہیں۔ قدیم مصری ایک لمبی عبا پہنتے ہیں اور سر پر عمامہ باندھتے ہیں۔ بعض لوگوں کا لباس ہنوز

مخلوط ہے۔ عبا پہنے ہوئے ہیں مگر اس پر ایک انگریزی چھوٹا کوٹ زیب تن ہے۔ نوجوان عموماً انگریزی لباس مگر "فیض" (ترکی ٹوپی) پہنتے ہیں۔ یہاں ہر وقت قلیاں گرم ہے۔ فرانس کی شراب سے لے کر مصر کے قہوے تک جملہ سامان شرب مہیا ہیں۔ اخبار تازہ ہر وقت موجود ہے۔ یہ بلا شبہ عجب خوش نظارہ ہے اور شہر کے حسن کا باعث ہے مگر اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مصریوں کو فرصت بہت ہے۔

مصری عموماً متواضع اور خلیق ہیں، رنگ و روغن میں جہاں بعض انگریزوں کو مات کرتے ہیں وہیں بعض اہل ہند سے ملتے ہیں۔ حریت پسند ہیں اور آزادی چاہتے ہیں، قابل ہیں مگر زیادہ محنت طلب نہیں۔ عورتیں اعلیٰ خاندانوں کی باہر نہیں نکلتی ہیں مگر شاذ۔ غریب عورتیں ایک عجیب بدقطع، بے وضع حجاب استعمال کرتی ہیں جس میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ امیر زادیاں جو اپنے آپ کو خانہ نشینی کی قید سے آزاد کر چکی ہیں ترکی یشمک کا حجاب استعمال کرتی ہیں اور اپنے مذاق کے مطابق ہلکا یا دبیز پہنتی ہیں۔ مساجد کا طرز وہی ہے جیسا کہ ترکی میں ہے، جس کے نقشے مقام خلافت میں موجود ہیں اور نہایت عمدہ اور دلکش طرز ہے۔ ان مساجد ہی میں قرآن شریف اور علم حدیث کے مکاتب ہیں۔

مصریوں نے اپنی تعلیم میں بہت کچھ اصلاح کر لی ہے۔ ہماری طرح یہ لوگ ایک غیر زبان کے حاصل کرنے، غیر ملک کے جغرافئے کا مطالعہ کرنے، غیر ملک کی تاریخ پڑھنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ بلکہ مغربی تعلیم اپنی زبان عربی میں حاصل کرتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ اور اپنے ملک کا جغرافیہ پڑھتے ہیں انگریزی اور مغربی علوم وفنون کی کتابیں بہت کچھ عربی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔

جہاز پر واپس آنے سے قبل ہم ''ڈی لیسیپ'' (De Lesseps) کا بت دیکھنے گئے۔ ایک ہاتھ میں نہر کا نقشہ ہے اور دوسرے ہاتھ سے نہر کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انجینیئر نے دنیا کے جغرافئے و قوموں کی تاریخ کو بدل دیا ہے۔

دو بجے کے قریب جہاز پر واپس گئے۔ یہاں سے اور کئی مسافر سوار ہوئے۔ ان میں کئی سیریا کے عیسائی ہیں، ایک مصری طالب علم ہے، ایک مصری حبشی ہے جو انگلستان میں اسکول کی تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے۔ ایک بیروت کا مسلمان طالب علم ہے جو برسلز (بلجیم) میں تعلیم پاتا ہے۔ یہاں سے وقت مقررہ پر لنگر اٹھایا۔ دودن کے بعد آبنائے مسینا کی سرزمین پر نظر پڑی۔ ایک جانب شہر مسینا تھا اور دوسری جانب قصبہ ریجو۔ باوجود سال

گذشتہ کے زلزلہ کی بربادی کے عجیب غدار شہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی انتہا ہی نہیں۔ پہاڑوں پر واقع ہے۔ سبزہ پوش وادیاں، خوبصورت مکان اہل روما کے طرز پر، سامنے صاف شفاف سمندر کا پانی، عجیب کیفیت کی جگہ ہے۔

دوپہر میں ایک کوہ آتش فشاں کے قریب گذر ہوا۔ جو ابھی سے کچھ کچھ دھواں اُٹھ رہا تھا۔ لاوا کے بہنے سے پہاڑ بالکل چوٹی سے نشیب تک نہایت چکنا ہو گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گو یہ خوابیدہ نہیں اور رات کو اس میں سے شعلے نکلتے بھی دکھائی دیتے ہیں مگر خدا کے بندے یہاں بھی آباد ہیں۔ ہر چار طرف سمندر ہے، اگر اس میں ذرا بھی چشمک ہو تو نہ جائے امن ہے نہ پناہ۔ عجیب ہمت ہے اور قابل داد بھروسہ۔ کل دس بجے مقام مارسلز پہنچ جاویں گے وہیں سے یہ خط روانہ ہوگا۔

امید ہے کہ بفضلہ تعالے بہرنوع خیروعافیت ہوگی۔ میں بھی اچھا ہوں۔ سمندر اب تک نہایت اچھا رہا، ایک دن البتہ بارش ہوئی اور جہاز پر بجلی گری مگر یہ ایک نہایت ہی معمولی بات ہے۔ برق کش موجود ہیں سوائے رعد اور کڑک کے کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔

حضور امی جان مکرمہ مدظلہا کی خدمت میں آداب عرض ہے۔

ستارہ بانو، حبیب الرحمٰن، روشن آرا، زیب النسا، جھو، زہرہ کو دعا اور پیار۔
زیادہ حد ادب۔

خیریت کا طالب
عبدالرحمٰن

(۲)

لندن۔ معرفت ہنری الیس کنگ کمپنی
مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۰ء

حضور امی جان مکرمہ مدظلہا

آداب دست بستہ گذارش ہے۔ والا نامہ جات صادر ہوئے اور بہ دریافت سلامتی مزاج خوشی ہوئی۔ الحمدللہ میں بہ خیریت ہوں اور ہمیشہ آپ کو اور سب کو اور گھر کو یاد کرتا رہتا ہوں۔

آپ نے جو رہنے اور خرچ وغیرہ کے متعلق حالات دریافت فرمائے ہیں سو یہ عرض ہے کہ میں لندن کے جس حصے میں رہتا ہوں اس کا نام "چزک" ہے۔ یہ شہر کے کنارے پر ہے، اس لحاظ سے کہ شور وشغب شہر کے اور حصوں سے یہاں کم ہے اچھا ہے، ورنہ اور جگہ ٹرام اور گاڑیوں کی آمد ورفت سے گھر بیٹھے بات سنائی نہیں دیتی مگر اس لحاظ سے کہ "لنکنز ان"

(Lincoln's Inn) سے جہاں پڑھائی ہوتی ہے بہت دور ہے ذرا اچھا نہیں۔ ''لنکنز ان''میں اوراس مقام میں بارہ میل کا فاصلہ ہے۔

پڑھنے کے لئے روز، اول ٹرام میں اور پھرز میں دوز ریل میں سوار ہوکر آتا اور جاتا ہوں اور اس کا خرچ ہر روز ایک شلنگ یعنی ۱۲ آنے ہوتا ہے۔

جس مکان میں میں رہتا ہوں اس میں تین آدمی مکان والے ہیں۔ ایک مسز بک ہیں، ایک ان کی چھوٹی بہن مس انڈ روڈ ہیں۔ یہ دونوں عمر رسیدہ عورتیں ہیں اور ایک مسز بک کا لڑکا ہے جو ایک بنک میں ملازم ہے۔

یہ لوگ تیسرے درجے کے لوگوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ اس سے اعلیٰ طبقے کے لوگ طالب علموں اور مہمانوں کو اس طور نہیں رکھتے، دوسرے اگر کوئی رہے تو ان کے اخراجات بہت کثیر ہیں۔

اس خاندان کی آمدنی جس کو یہاں کے لحاظ سے محض گذارہ کرنے والا کہتے ہیں چار سو روپیہ ماہوار سے زائد ہے اور جائداد اور کمپنیوں میں حصے اور بیمہ وغیرہ اس کے علاوہ ہے۔

مجھ کو ایک سو بیس روپیہ ماہوار ان کو کھانے اور رہنے اور کپڑوں کی

دھلائی کا دینا پڑتا ہے۔

اس میں ایک سونے کا کمرہ ہے۔ یہ عرض وطول میں ۱۶۔۱۶ افٹ ہے۔ اس میں عمدہ فرش بچھا ہوا ہے۔ سونے کا پلنگ لوہے کا بہت بڑا ہے۔ بچھونے وغیرہ یہ خود دیتے ہیں اور بہت آرام دہ اور کافی ہے۔ اس میں میز سنگ مرمر کی ہے جس پر منہ دھونے کا طسلہ اور سامان موجود ہے۔ ایک اور میز اور دراز والی الماری ہے، اس پر کنگھا برش رکھنے کا انتظام ہے۔ ایک اور بڑی الماری ہے جس میں کپڑے ٹانگ سکتے ہیں، تین بہت بڑے بڑے آئینے مختلف مقامات پر ہیں۔ تصویریں ہیں، چیزیں سجی ہوئی ہیں، آتشدان ہے۔ تولیہ وغیرہ مہیا کرنا بھی ان ہی کا کام ہے۔

اس طور ان میں سے ہر شخص کا کمرہ آراستہ ہے اور یہ لوگ بہت معمولی اور کم حیثیت سمجھے جاتے ہیں۔

دن میں بیٹھنے اُٹھنے اور دوستوں سے ملنے کے لئے ایک اور کمرہ ہے۔ اس میں دن بھر آگ جلتی رہتی ہے۔ اسی میں کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے اوقات کے علاوہ حسب ضرورت پڑھنے لکھنے کے اوقات میں یہاں کوئی نہیں آتا۔

یہ بھی نہایت درجہ آراستہ ہے۔

صبح جس وقت کے لئے کہہ دیا جائے دروازہ اُٹھ بیٹھنے کے لئے کھٹکھٹادیا جاتا ہےاور گرم پانی دروازے کے باہر رکھ دیا جاتا ہے۔

ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد منہ ہاتھ دھوکر اور کپڑے پہن کر باہر آتے ہیں۔

یہ قاعدہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے سونے کے کمرے میں نہیں جاتا۔ صرف ملازمہ دن کے وقت جب کمرے والے باہر ہوں سب چیزوں کو درست کرنے اور قرینے سے لگانے کے لئے جاتی ہے۔

نیز کوئی شخص رخت خواب یا صرف قمیص پہنے یا بغیر کوٹ پہنے کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔

نیچے حاضری، تیار ملتی ہے۔ اس وقت کوئی اور شریک نہیں ہوتا۔ حاضری میں ہمیشہ دلیا اور دودھ، انڈے پکے ہوئے، انڈے ابلے ہوئے، توس، جام اور چاء (چائے) ملتی ہے۔

اس کے بعد دن کا کھانا ایک بجے ہوتا ہے۔ اس میں ہمیشہ ایک کھانا نمکین اور ایک کھانا شیریں ہوتا ہے۔ اس کے بعد پانچ بجے چاء، توس اور مکھن، کیک وغیرہ ملتے ہیں۔

اس کے بعد شب کا کھانا آٹھ بجے ہوتا ہے۔ اس میں شوربا پہلے،

پھر مچھلی، پھر گوشت اور پھر کوئی شیریں چیز ملتی ہے۔

سوتے وقت سپر یعنی نیم شب کا کھانا ہوتا ہے۔ اس میں صرف چاء اور میوہ ہوتا ہے۔

یہاں کی آب و ہوا میں آدمی اس کھانے کو کھا سکتا ہے ورنہ ہندوستان میں ممکن نہیں۔ میں بھی ہر وقت اور اچھی طرح کھاتا ہوں۔

اس کے علاوہ اور اخراجات اس طرح کے ہوتے ہیں کہ کبھی کسی وجہ سے دن کے کھانے پر نہیں آسکتے تو "لنکنز ان" میں یا کہیں اور کھانا پڑتا ہے اور دام دینے پڑتے ہیں۔

ماسوا کبھی کبھی سیر کے لئے جاتا ہوں اور دو تین مرتبہ تماشا وغیرہ دیکھنے بھی گیا ہوں۔

یہاں ہر شے کی قیمت قیاس اور گمان سے زیادہ ہے۔ ایک اشرفی کی یہاں وہی قیمت ہے جو ہندوستان میں ایک روپے کی ہے۔

غرض مہینے بھر میں باوجود کوشش کے دوسو روپے دس پانچ چھوڑ کر سب خرچ ہو جاتے ہیں۔

تین جوڑی کپڑے اور ایک کھانے کا لباس بنوایا ہے۔

پڑھائی وغیرہ میں کوشش سے مصروف ہوں۔

یہ ارادہ کر رہا ہوں کہ جلد جرمنی چلا جاؤں۔ وہاں سے کچھ جواب وغیرہ آئے تو پھر مفصل وہاں جانے کے متعلق اطلاع دوں گا، اور آئندہ کے ارادوں کے متعلق بھی اطلاع دوں گا۔

طبیعت ہنوز اچھی طرح نہیں لگی۔ گھر کے سب لوگ نہایت خلیق اور اچھے اور ازحد خاطر کرنے والے ہیں مگر پھر بھی یہاں کے قواعد اور آداب ایسے مختلف ہیں کہ طبیعت لگنا آسان نہیں۔ وہ آزادی اور وہ آرام اصلی جو ہندوستان میں ہے اس ملک میں نہیں۔

تصدق، محمود اور اور دوست کبھی کبھی ملتے ہیں اور بھی علی گڑھ کے بہت سے لڑکے ہیں جن کو میں جانتا ہوں۔ مگر یہاں کسی سے دوستی اور ربط ضبط رکھنا درست نہیں۔

سید صاحب کے پوتے سید راس مسعود سے بھی ملا۔ انھوں نے ماشاءاللہ بہت اچھی ترقی کی ہے۔

پڑھائی کا طریقہ یہ ہے کہ دو مہینے پڑھائی ہوتی ہے اور دو مہینے تعطیل رہتی ہے۔

لکچروں میں جانا اگرچہ مفید ہے مگر ضروری نہیں۔ پھر بھی عموماً طلباء برابر حاضری دیتے ہیں۔

اور کیا کیفیات لکھوں، سب بدستور ہیں۔ موسم ہنوز ایسا زیادہ سرد نہیں کہ نا قابل برداشت ہو، اچھا خاصہ موافق ہے۔

برف ابھی تک نہیں پڑی مگر بارش عموماً ہوتی رہتی ہے جس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

آپ کی اور سب کی خیریت نام بنام ہر خط سے ہمیشہ مطلوب ہے۔ امید ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ آپ بہرنوع مع الخیر اور خوش ہوں گی۔ اور اور سب بھی اچھے ہوں گے۔

روشن آرا کی طرف سے ہمیشہ سخت تردد ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے اطمینان دلائے تو تسلی ہو۔ مفصل لکھئے کہ کسی قسم کا فرق نمایاں ہے یا نہیں۔

بدرالدین کے خطوط دو تین علی گڑھ سے آئے۔ ایک خط پچھلی ڈاک میں بھی آیا ہے، لکھا ہے کہ بہ خیریت ہیں اور سیوہارے میں بھی سب خیریت وعافیت ہے۔ ماموں جان قبلہ کا کوئی خط کئی ہفتوں سے نہیں آیا شاید آئندہ ہفتے میں صادر ہو۔ بھائی نظیرالدین کا خط اس ہفتہ آیا ہے، بہ خیریت ہیں۔

خطوں کا ہمیشہ ہر شخص کے منتظر رہتا ہوں گو جواب دینے میں دقت معلوم ہوتی ہے۔

اور کوئی امر قابل گذارش نہیں جو عرض کروں۔ اور جو بات دریافت طلب ہو لکھ بھیجوں گا۔ یہاں کی کوئی کیفیت یا حالت لکھنا اس قدر مشکل ہے کہ ممکن نہیں، کیونکہ ہر بات نئی ہے۔

حضور ابا جانی قبلہ کی خدمت میں آداب گذارش ہے۔ چنو میاں، ستارہ، روشنا، زبین، جھو کو دعاء اور پیار۔ زہرہ کو پیار۔ زیادہ حد ادب

عبدالرحمٰن

(۳)

لندن،

۲۳ دسمبر ۱۰ء

پیاری بہن ستارہ بانو سلمہا

بعد دعا۔ امید ہے کہ تم بفضلہٖ مع الخیر اور خوش وخرم ہوگی۔ تمہارے خطوط پہنچے اور بہ دریافت خیریت اطمینان ہوا۔ الحمد للہ میں اچھی طرح ہوں اور ہمیشہ سب کی عافیت کا طالب۔ تم نے جو یہ دریافت کیا ہے کہ یہاں کے حالات لکھوں سو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سے حالات تمہارے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ بہر حال غور کے بعد مکان کی کیفیت کے مضمون پر کچھ لکھتا ہوں۔

ہر عمولی حیثیت کے انگریز کے مکان کی کیفیت کسی قدر یہ ہے:۔

سڑک کے کنارے مکان واقع ہے دومنزلہ عمارت ہے اور دو ایک سہ منزلہ بالاخانے ہیں۔

سڑک کے ساتھ جہاں پیادہ پا چلنے والوں کی پٹڑی ختم ہوتی ہے وہاں مکان کی حد بندی کے لئے لوہے کا جنگلہ لگا ہوتا ہے۔ اس جنگلے کے پانچ سات فٹ تک زمین چھوڑ دی جاتی ہے اور اس میں دونوں جانب گھاس پھول پھلواری وغیرہ لگاتے ہیں۔ بنگلے کے بیچ کے دروازے سے مکان کے باہر کے دروازے تک خوبصورت چینی کے ساختہ پتھروں کا فرش ہوتا ہے جیسا کہ نئے اسکول کے دروازے کے سامنے ہے۔ اسی فرشی راستے کے اختتام پر بڑا دروازہ ہے۔

ہر دروازے میں ایک خط ڈالنے کا بکس ہے کیونکہ ہرکارہ یہاں خط دینے کے لئے ٹھہرتا نہیں بلکہ بکس میں ڈال کر دستک دے کر چلا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک دستک دینے کا پیتل کا کنڈا ہے اس کو گھر کے لوگ اور ہرکارے استعمال کرتے ہیں۔ جو شخص آتا ہے اس سے اطلاع دیتا ہے اور دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔

مہمانوں کے لئے علیٰحدہ گھنٹی لگی ہے، وہ اس گھنٹی کو دباتے ہیں تا کہ

مکان والے مہمان کی آمد کے لئے تیار ہوسکیں اور غلطی میں نہ رہیں۔

ہر دروازے میں اس قسم کا قفل ہے کہ اندر سے باہر جانے والا ہر وقت جا سکتا ہے اور باہر سے اندر آنے والا ہرگز نہیں آسکتا جب تک کہ مکان والا دروازہ نہ کھولے۔ اگر حسب ضرورت کوئی مکان والا دیر میں گھر آنا چاہے تو ایک کنجی اپنے ساتھ لے جاتا ہے، اس سے یہ دروازہ باہر سے بھی کھل سکتا ہے۔

مکان کے اندر داخل ہونے پر معلوم ہوگا کہ مکان کے تین حصے ہیں۔

اوپر کی منزلوں میں سونے کے کمرے ہیں اور غسل خانے وغیرہ ہیں۔

نیچے کے حصے میں ایک کھانا کھانے اور اٹھنے بیٹھنے کی منازل ہیں، دوسرے باورچی خانہ اور گودام وغیرہ ہیں۔

مکان کے پشت کی جانب شیشہ خانہ ہے جس میں پھول وغیرہ کے گملے رکھے جاتے ہیں، اس کے بعد صحن ہے جس میں مختصر سا باغیچہ ہے۔

سونے کے کمرے کی کیفیت پہلے اور امی جان کے خط میں لکھ چکا ہوں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ لحاف کے دونوں جانب بھی سفید چادریں

لگائی جاتی ہیں تا کہ میلا نہ ہو اور بچھونے کی چادروں کے ساتھ ان کو بھی بدلتے رہتے ہیں۔

میلے کپڑے رکھنے کے لئے ایک تھیلی ایک الماری کے اندر لٹکتی رہتی ہے، اس میں میلے کپڑے رکھتے ہیں۔ ہر شخص کے میلے کپڑے اس کے سونے کے کمرے کی الماری کی تھیلی میں رہتے ہیں، وہیں سے خادمہ لے جاتی ہے۔

بوٹ سوتے وقت کمرے سے باہر رکھ دینے سے خادمہ رات ہی میں صاف کر کے صبح صبح وہیں رکھ دیتی ہے۔

ہر شخص سونے کا لباس علیحدہ رکھتا ہے۔ عورتیں ایک خوبصورت لمبا سا گون نما نیچا کرتہ پہنتی ہیں۔

منہ دھونے کی سیلانچی، آفتابہ معہ پانی کے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

(کھانے کا کمرہ)

کھانے کا کمرہ نہایت آراستہ اور عمدہ ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ باورچی خانے سے متصل ہوتا ہے اور اس کے اور باورچی خانے کے بیچ میں ایک کمرہ ہوتا ہے جس کو کھانا کھلانے کا کمرہ کہتے ہیں۔

کھانا باورچی خانے سے قابوں میں لا کر اس کمرے میں لایا جاتا

ہے۔ اس میں کھانے کے کمرے کی دیوار کے اندر ایک کھڑکی ہوتی ہے، وہاں رکھ دیا جاتا ہے وہاں سے اٹھا کر میز پر لگایا جاتا ہے تاکہ کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور راستے میں گرنے وغیرہ سے محفوظ رہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر ہم نئے برآمدے کو کھانے کا مقام فرض کریں تو بیچ کے کمرے کو کھانا کھلانے کا کمرہ بنا سکتے ہیں، صرف اس سے باورچی خانہ کو راستہ بنانا پڑے گا۔

کھانا میز پر کھاتے ہیں۔ میز پوش، رومال وغیرہ نہایت عمدہ ہوتے ہیں۔ ہر شخص کی جگہ مقرر ہے۔ ہر کھانے میں صاحب خانہ صدر ہوتی ہے، وہی کھانے کی بڑی قاب میں سے ہر ایک کی قاب میں کھانا لگا کر اس کو دیتی ہے۔ جب تک وہ نہ اٹھے کوئی میز پر سے نہیں اٹھتا۔

ایک کورس ختم ہونے کے بعد گھنٹی بجائی جاتی ہے اور خادمہ جھوٹے برتن اسی راستے سے واپس لے جاتی ہے اور دوسرا کھانا اور نئے برتن رکھ دیتی ہے۔

اس درمیان میں ملازمہ باہر کھڑی رہتی ہے، کمرے میں نہیں۔

پانی شیشے کے برتن میں رکھا رہتا ہے اور ہر شخص کے پاس اپنا گلاس ہوتا ہے۔

تمام ظروف چینی اور شیشے کے ہوتے ہیں۔

کھانا کچھ لذیذ نہیں ہوتا، زبان کا چٹخارہ تو ان لوگوں میں نام کو نہیں۔ مگر پھر بھی خاصہ ہوتا ہے۔ بعض چیزیں البتہ ایسی ہیں کہ حلق سے پار ہونا مشکل ہے۔

گرم کھانے کے لئے پلیٹ ہمیشہ پکتے پانی میں ڈال کر گرم لائی جاتی ہے تاکہ کھانا سرد نہ ہو اور سرد کھانے کے لئے ہمیشہ سرد لائی جاتی ہے تاکہ گرم نہ ہو۔

(باورچی خانہ)

باورچی خانے کا انتظام گھر والیاں خود کرتی ہیں ماما ہاتھ بٹاتی ہے۔ باورچی خانے میں ایک جانب سرد پانی کا نل دوسری جانب گرم پانی کا نل ہے اور ایسا انتظام ہے کہ سب پانی زمین میں دوز نالیوں میں چلا جاتا ہے۔ چولھا گیس کا ہے، جب چاہا جلا لیا جب چاہا بڑھا دیا۔ جس قدر تیز آنچ چاہی خود کر لی۔ نہ راکھ ہے نہ انتظار۔

چونکہ کھانا بہت روکھا پھیکا ہے پکنے میں دیر کم لگتی ہے۔ اگر ہندوستانی کھانا ہو اور اس قدر دفعہ پکانا پڑے تو گھر والیوں کو بھی لطف آ جائے۔

خادمہ ہندوستانی ماما کی طرح نہیں، کوئی شخص بغیر ''مہربانی فرما کر یہ

کر دیجئے'' کہنے کے بات نہیں کر سکتا اور ہر چیز پر شکریہ ادا کرنا پڑتا ہے اگر کوئی نقصان کر دے جرمانہ لے لیجئے لیکن اگر آپ نے ایک بات بھی کہی تو عدالت میں جانے کے لئے تیار ہے اور اگر پان سو روپے دے کر بھی معاملہ فیصل ہو جائے تو آپ ہی نفع میں رہے۔ یہاں کوئی کسی کا نوکر نہیں اپنے کام کا نوکر ہے۔

خادماؤں کا لباس مقرر ہے۔ دن کے وقت نیلے رنگ کی جاکٹ اور گون پہنتی ہیں، اوپر سفید ایپرن ہوتا ہے سر پر سفید ٹوپی ہوتی ہے۔ رات کو کالا لباس ہوتا ہے ہر ہفتہ دونوں لباس آپ کو مہیا کرنا ہوتے ہیں۔

تنخواہ اس کی فی ہفتہ پندرہ روپے ہے۔ ہر شخص کو ہفتہ وار تنخواہ ملتی ہے۔

تمام خادمائیں اپنے کاموں میں از حد چست و چالاک، نہایت فرماں بردار اور ایمان دار ہوتی ہیں۔ جمعرات کو آدھے دن کی چھٹی ہوتی ہے اور اتوار کو بالکل کام پر نہیں آتیں۔ شام کو ٹہلنے کے لئے جاتی ہیں۔

(بیٹھنے کا کمرہ)

بیٹھنے کا کمرہ نہایت عمدہ آراستہ ہوتا ہے۔ اس میں سب سے ضروری چیز پیانو ہے۔ ایک پیانو کی قیمت پندرہ سو یا دو ہزار سے کم نہیں ہوتی۔ کمرہ

میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے۔

آتشدان دو طرح کے ہیں، ایک میں گیس جلتی ہے ایک میں کوئلہ جلاتے ہیں۔ کوئلے کے آتشدان کو پسند کیا جاتا ہے کیونکہ یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ جب تک آگ کو چھیڑتے نہ رہو لطف نہیں آتا۔

یہاں کی چمنیاں ایک لاجواب چیز ہیں، ایک آتش دان کی قیمت پانچ سو روپے کم و بیش ہوتی ہے. آتشدان چوٹی سے لے کر نیچے تک سنگ مرمر کا ہوتا ہے اور بیچ کا لوہے کا حصہ بہت خوبصورت بناتے ہیں۔ سامنے پتھر کا فرش ہوتا ہے جس کے گرد جنگلہ لگا رہتا ہے اور اس پر متعلقہ اوزار دست پناہ وغیرہ رکھے رہتے ہیں۔

اس کے گرد لوگ بیٹھتے اور باتیں کرتے ہیں۔ بیچ کا لوہے کا حصہ جس میں آگ جلتی ہے ایسا ہوتا ہے کہ تمام کُھل جاتا ہے اور صاف ہو سکتا ہے۔ آگ روشن کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لکڑی کی موٹی موٹی تیلیاں کوئلے رکھ کر ان کے بیچ میں رکھتے جاتے ہیں اور پھر آگ لگاتے ہیں۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر کمرے اور ہر مقام میں خواہ وہ غسل خانہ ہو، سونے کا کمرہ ہو، ڈیوڑھی ہو، کھانے کا کمرہ ہو، بیٹھنے کا کمرہ ہو، متعدد قد آدم شیشے رکھے رہتے ہیں۔ یہاں کے مرد عورت دن میں جب تک

دس مرتبہ اپنے بناؤ سنگار کو نہ دیکھ لیں رہ نہیں سکتے۔

(غسل خانہ)

غسل خانے میں ایک جانب بہت بڑا طسلہ منہ دھونے کے لئے لگا رہتا ہے۔ یہاں صابن تو لئے متعدد، برش وغیرہ ہر چیز مہیا رہتی ہے۔ نہانے کے لئے اسفنج، جھانوا وغیرہ موجود رہتا ہے۔ ٹب اکثر شیشہ کا ہوتا ہے اور اتنا بڑا کہ خاصہ حوض سمجھنا چاہئے۔

ہر وقت شب و روز گرم اور سرد پانی مہیا رکھا جاتا ہے۔

(عام)

مکانات کی دیواریں تمام کاغذ سے منڈھی رہتی ہیں۔ یہ کاغذ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان میں اس وجہ سے استعمال نہیں ہوسکتا کہ کیڑے خراب کر دیں۔ یہاں مکھی، مکڑی، کرہ، سانپ، بچھو کوئی جانور نہیں۔ عجب مقام عافیت ہے۔

گھروں میں یا تو بجلی کی روشنی ہے یا گیس جلتی ہے۔ مٹی کا تیل سوائے شاذ و نادر حالتوں کے کہیں نہیں جلایا جاتا۔

حقیقت میں ان چیزوں کا دیکھنا ایک بہت بڑی تعلیم ہے مگر عورتوں کے لئے نہ کہ مردوں کے لئے۔

سودا سلف کا یہ دستور ہے کہ دکان والوں سے مقرر ہے ان ہی کا آدمی روز آ کر سودا پہنچا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جس شے کی ضرورت ہو عورتیں خرید کرتی ہیں۔

حساب کتاب رکھنا بھی عورتوں کا کام ہے۔ غرض مکان کی اندرونی حکومت اور نظامت سے مردوں کو کچھ علاقہ نہیں۔ عورتیں انتظام میں مردوں کے بھی کان کاٹتی ہیں۔ ہر بات میں بحث کرنے کو مردوں سے زیادہ تیار ہیں۔

اخبار کے بغیر یہاں کوئی مہتر تک بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ جھاڑو دے رہے ہیں اور اخبار ملاحظہ ہو رہا ہے۔ سب عورتیں اخبار پڑھتی ہیں۔

مکانات کو صاف رکھنے، ہمیشہ صاف لباس رکھنے، بچوں کو صاف رکھنے میں ان کا ایسا سلیقہ ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔

مگر باوجود ان سب باتوں کے اور ان سب خوبیوں کے ہندوستان کی عورتیں ان سے بہتر ہیں۔ اور اگر ان کی حالت درست ہو جائے اور ان باتوں کا خیال کرنے لگیں تو ان سے کہیں بڑھ جائیں۔

ان عورتوں میں عیوب بھی بڑے سخت ہیں۔

اُمید ہے کہ اس مختصر بیان سے کچھ کیفیت تمہیں معلوم ہوگئی ہوگی۔

اگر اور کوئی خاص بات دریافت کروگی تو تفصیل سے لکھ دوں گا۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو بات پوچھنی ہو ایک سوال کے طریق پر لکھ دیا کرو اور میں جواب لکھ دیا کروں گا۔

اپنی خیریت اور ہر خورد و کلاں کے حالات سے اطلاع دیتی رہو۔ امید ہے کہ تم بہر نوع خوش و خرم ہو گی۔

زیادہ دعا

عبدالرحمٰن

(۴)

لندن،

۵ جنوری ۱۱ء

پیارے بھائی

شاد باش، زندہ باش۔ تیرا خط ۱۳ دسمبر سنہ گذشتہ کا تحریر کیا ہوا ملا۔ المکتوب نصف الملاقات، بے انتہا باعث مسرت اور خوشی ہوا۔

الحمدللہ کہ تیرا بھائی بخیریت ہے اور ہمیشہ تیری، اپنے ماں باپ، بہنوں اور بیوی اور بچی کی خیریت کے لئے دعا گو اور عافیت کا جویاں ہے۔ میں یہاں سے دو ہفتے میں جرمنی چلا جاؤں گا۔ وہاں ڈگری لینے

کے لئے یونیورسٹی میں داخل ہوں گا۔ صرف قانون کی حاضری کے لئے انگلستان آیا کروں گا۔ میں نے یہاں آ کر بندروں اور لنگوروں کی نسبت کوئی نئی تحقیقات نہیں کی مگر اپنا یقین ہے کہ شروع کے چار پانچ مہینوں تک زبان نہ جاننے کی وجہ سے جرمنی میں میری اپنی حالت بندروں اور لنگوروں کی سی رہے گی۔ یہ بھی بذات خود ایک تجربہ ہوگا۔

میں تم کو کیا لکھوں۔ میری رائے میں اگر میں تمہیں یہ بتلاؤں کہ تم کو اپنی آئندہ تعلیم اور ترقی کے لئے کیا کیا کرنا چاہئے تو نہایت مناسب ہوگا مگر یہ وعدہ کرو کہ افراط اور تفریط کی غلطی نہیں کرو گے۔

سب سے پہلی بات اور غلطی جو مجھ کو اپنی تعلیم میں یہاں آ کر معلوم ہوئی وہ مذکورہ ذیل تھی۔

من نکردم شما حذر بکنید، میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی تمہارے آئندہ راستے میں اگر ممکن ہو سکے تو راہنما ہو۔ وہ غلطی یہ تھی کہ جہاں میں نے اپنے دماغ اور روح کو علم سے نشوونما دینے میں اپنی وسعت سے زیادہ کوشش کی وہیں اپنے جسم اور قویٰ پر ظلم کرتا رہا۔ حالانکہ حقیقی انسان اس وقت تک نہیں بنتا جب تک کہ نہ صرف روح تربیت یافتہ ہو بلکہ روح کا مسکن یعنی جسم بھی حالت صحیح میں ہو۔

یہاں جس قدر علماء فضلاء کو دیکھئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون کا دماغ سکندر کے جسم میں مسکن پذیر ہے یا موجودہ زمانے کی مثال سے ہیگل کی روح سینڈو کے جسم میں موجود ہے۔ یہی ان لوگوں کی اعلیٰ تصانیف، عجیب صنائع، حیرت انگیز ایجادات، اور قومی کارناموں کا سب سے بڑا راز ہے۔

پس تم ابھی سے اپنے جسم کی بہر طور حفاظت کرنا۔ خدا اس کو امراض اور حوادث سے محفوظ رکھے۔ تم خود ورزش اور تفریح سے اس کو غذا پہنچانا تا کہ جب تم ماشاء اللہ جوان ہو تو اپنے بھائی سے نہ صرف دماغی قابلیت میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہو بلکہ ذاتی وجاہت، صورت اور قبولیت جسم میں بھی کامل انسانیت کا نمونہ ہو۔

میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ حقیقت میں تمھارے اندر اس اجتماع سعدین سے وہ خوبیاں اور محاسن پیدا ہوں جو انسانوں کو برگزیدہ بناتے ہیں۔

یہاں بچے، عورتیں، جوان تو ایک طرف عمر رسیدہ لوگ کالجوں کے پروفیسر تک بھی جو خشک طبعی کے لئے مشہور ہیں ہمیشہ ہر قسم کے کھیل کود میں شریک ہوتے ہیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو فٹ بال، کرکٹ، ہاکی، تیرنا،

درخت پر چڑھنا، سکیٹنگ کرنا، پہیئے دار جوتوں سے چلنا، ناچنا، گھوڑے کی سواری، بائیسکل اور موٹر چلانا، تاش کھیلنا، شطرنج کھیلنا، ڈرافٹ کھیلنا، گانا، باجہ بجانا، پیانو بجانا، نہ جانتا ہو۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے، یہی وجہ ہے کہ باوجود ایسی سخت محنت کرنے کے جس کا ہندوستان جیسی گرم آب و ہوا میں رہنے والوں کو کوئی اندازہ نہیں، یہ لوگ ہمیشہ صحیح البدن رہتے ہیں۔ جو آدمی یہاں ان چیزوں سے ناواقف ہو اس کو ہر شخص تعجب سے دیکھتا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔

میرے خیال میں اس کے متعلق اتنا لکھنا کافی ہوگا کیوں کہ تم جیسے رسا دماغ کے لئے اشارہ ہی کافی ہے۔ مگر پھر مکرر یاد دلاتا ہوں کہ میزان اور تعدیل کا خیال رہے۔ اگر صرف جسم بن گیا تو محض حیوان ہے اور اگر جسم نحیف رہ گیا تو ناقص انسان ہے۔ اصلی معیار اور مثالیہ کامل انسان اُس کو سمجھنا چاہئے جس کی تعریف میں اس سے قبل کر چکا ہوں۔

اب رہی دماغی تعلیم سو پیارے بھائی! اس میں ہندوستان کے لوگ سخت بدقسمت ہیں۔ ایسی بے ربط اور ناقص تعلیم سے جیسی کہ اسکولوں میں ہے سوائے اس کے کہ دماغ کو نقصان پہنچے کوئی فائدہ نہیں۔ تاہم چونکہ اس سے گریز ناممکن ہے اور بلا اس کے کوئی چارہ اور مفر نہیں ہے اس کا حصول

لابدی ہوگیا ہے۔ اپنے امتحانات کے پاس کرنے میں کوشش اس لئے لازمی ہے۔ مگر زیادہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وقت کا بیشتر حصہ سب سے پہلے ۔انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں صرف کیا جائے کیوں کہ، نظر برحالات، اس کا فائدہ مستقل اور اس کا علم مفید ہے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انگریزی کی سہل اور آسان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ مگر اپنی استعداد سے زیادہ مشکل کتاب ہرگز نہ پڑھنی چاہئے۔ ایسا کرنا بالکل ایسی ہی غلطی ہے جیسے کوئی آدمی اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اُٹھالے اور اپنے جسم کو نقصان پہنچائے۔ مضامین کے لحاظ سے اُس مضمون کی کتابیں بیشتر دیکھنا چاہئیں جس میں دلچسپی ہو اور جس کی آئندہ تعلیم حاصل کرنے اور جس میں مہارت اور قابلیت کے حصول کا خیال ہو مگر علاوہ بریں ہمیشہ کچھ کتابیں قصوں اور کہانیوں کی بھی دیکھتے رہنا چاہئے اور عمدہ ناولوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس ملک میں آج کل یہ کوشش ہے کہ جملہ علوم وفنون کے مسائل کو ناولوں میں بیان کیا جائے تا کہ پڑھنے میں دلچسپی ہو اور علوم کو فروغ اور اشاعت ہو۔ گو علم کی پری کا اس شیشے میں اُتارنا آسان نہیں تاہم طبائع کا رجحان اسی طرف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کوئی انسان جب تک کہ اپنی قومی اور ملکی زبان

کا ماہر نہ ہو باوجود ہمہ علم و قابلیت ''چار پائے بر و کتابے چند'' کا کم و بیش مصداق ہے۔ ہم ہندوستانیوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم میں سے کوئی انگریزی زبان میں ملٹن یا شیکسپیر کا پایہ حاصل کر سکے مگر ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم غالب اور اقبال کے درجے کو پا جاویں۔ اگر کوئی علمی فتوحات ہم سے ممکن ہیں تو اپنی زبان ہی میں ممکن ہیں۔ اور ہماری تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ہم اردو سے ناواقف رہتے ہیں، پس اگر اس کمی کو نجی طور پر پورا نہ کیا جائے تو تمام تعلیم اور کوشش اور جدوجہد علمی بیکار ہے۔ یہ ایک ایسی محنت ہوگی جو کبھی بار آور نہ ہوگی۔

فرصت کے اوقات میں اردو کی معقول تصنیفات جن کی گواہی سرسید، مولانا حالی، شبلی، نذیر، آزاد، غالب، اقبال، انجمن ترقی اردو، اردو کانفرنس وغیرہ کے ناموں سے لی جاسکتی ہے، غور سے مطالعہ طلب ہیں۔

گفتگو میں ہمیشہ پاک اور غیر ملوث زبان بولنی چاہئے مگر تحریر میں غیر زبان سے مدد لینا میری رائے میں تو بمنزلہ کفر کے ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ فارسی ہمارے مدارس کی تعلیم میں شامل ہے مگر ہم اس کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتے۔ کچھ مولوی صاحب کی نیکی، کچھ اردو کی واقفیت کی وجہ سے فارسی کی واقفیت، ان سب کے باعث امتحان میں

کسی طرح نکل جاتے ہیں۔ پھر کیا تھا اپنے آپ کو بزعم خود فارسی داں سمجھ لیتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس زبان کے حصول کی جانب سخت کوشش کریں اس وجہ سے کہ یہ مشکل نہیں اور سوائے فرانسیسی کے دنیا کی سب زبانوں میں شیریں ہے۔

چوتھا مضمون جو تمھارے آئندہ ارادوں کے لحاظ سے ضروری ہے ریاضی ہے، چوں کہ میں اس میں ہمیشہ پھسڈی تھا میری رائے اس کے مطالعے کے طریقے کی نسبت کسی کام کی نہیں ہوسکتی۔ مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس میں تم جس قدر کوشش کرو کم ہے۔ جتنا زیادہ جانو گے اتنا ہی آئندہ تعلیم میں کام آئے گا۔ بالخصوص علم مساحت (Mensuration)، علم مساحت عملی (Practical Mensuration)، علم مثلث و مخروط (Trignometry) علم جرثقیل (Mechanics)، علم الماء (Hydraulics) وغیرہ کے متعلق ریاضی میں کامل واقفیت لابدی ہے۔ سب سے ضروری دو باتیں ہیں: اول یہ کہ ریاضی میں مشق ضروری ہے دوسری پہلی بات کو سمجھ کر دوسری بات شروع کرنا چاہئے۔

مگر ایک نہایت ضروری پہلو ابھی رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر آئندہ اعلیٰ انجینیر نگ کی تعلیم کا قصد ہے تو اپنے اوزاروں کے شوق کو نہ صرف

جاری رکھو بلکہ بڑھئی اور لوہار کا کام جس درجہ ہندوستان میں سیکھا جاسکتا ہے سیکھ لو ازحد مفید ہوگا۔ یہاں انگریزوں کے لڑکے جب انجینیر نگ میں شامل ہوتے ہیں تو ریاضی میں ہندوستانیوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے اس بارے میں ہندوستانی بڑھے رہتے ہیں مگر جب مشینوں کے سمجھنے کا معاملہ آتا ہے اور بڑھئی اور لوہار کی ادنیٰ اور اعلیٰ باتوں کے علم کے متعلق سوال ہوتا ہے تو بیچارے ہندوستانی ایک لفظ نہیں جانتے اور انگریز بچے بن سمجھے سب کچھ پہلے سے جانتے ہیں۔ اگر کچھ عرصے یہ دونوں کام سیکھ لوگے تو پھر سوجھ خود بخود بڑھ جائے گی اور سینکڑوں ایسی باتیں معلوم ہو جائیں گی جو کتابوں کے مطالعے سے نہیں آسکتی ہیں۔

رہے تمھاری تعلیم کے اور مضامین مثلاً جغرافیہ، تاریخ، قواعد، گرامر، یہ سب رطب و یابس ہیں۔ اتنا علم جتنا کہ ان کا پڑھنے سے ہوتا ہے ہوا تو کیا اور نہ ہوا تو کیا۔ جغرافیہ دنیا دیکھنے سے آتا ہے اور تاریخ صحیح کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے۔ لیتھرج کو صحیح مان لینے سے سوائے اس کے کہ انسان اپنے بزرگوں پر اتہام باندھنے لگے اور جھوٹی تہمت لگانے لگے اور کچھ نہیں آتا۔ بہر حال جہاں تک امتحان کا تعلق ہے ان کو بھی داروِ تلخ سمجھ کر اور مضامین کے ساتھ نوش کرو۔ اور چارہ ہی کیا ہے!

اگر تم میرے بڑے ہوتے اور میں چھوٹا ہوتا اور یہ خط تم مجھ کو لکھتے تو میں ضرور کہتا کہ میاں چونکہ خود سب مراحل طے کر چکے ہیں ناصح بن گئے ہیں۔ اگر خود کوئی یہ سب باتیں کرنے کو کہہ دیتا اور کر لیتے تو ہم بھی دیکھتے۔ مگر تم زیادہ سعادت مند ہو۔ جن باتوں کو قابل عمل پاؤ اور جن سے خود اتفاق کرو، ان کی جانب کوشش کرو کیوں کہ زندگی کا حقیقی کارساز خدا ہے۔ تدابیر پر ہمیشہ تقدیر غالب ہے۔ انشاء اللہ جس راستے سے تم آؤ گے محافظِ حقیقی اپنے سایۂ عاطفت میں بحفاظت تم کو ترقی کے انتہائی عروج تک پہنچا دیں گے ہمیشہ میری یہی دعا ہے۔

مجھے حقیقت میں فرصت کم رہتی ہے اس لئے اگر خطوں کا جواب دینے میں توقف ہو یا تاخیر ہو تو قابل معافی ہے۔

ستارہ بی، زیب النساء کے خطوط نوروز کی مبارک باد موصول ہوئے۔ تم سب کے کارڈوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ وکالتاً شکریہ میری جانب سے اُن تک پہنچا دو۔ اور کوئی بات قابل اطلاع نہیں ورنہ تحریر کرتا۔

پیارے بھائی! تیرا بھائی تجھ کو ہمیشہ یاد کرتا ہے اور ہمیشہ اس خیال سے خوش ہے کہ تو اس کے لئے نہ صرف قوت بازو ہوگا بلکہ زندگی کا سب سے بڑا رفیق دوست ہوگا، اور امید ہے کہ ہم دونوں اپنے ماں باپ کی خدمت بجا

لائیں گے۔

یہ خط میں نے محبت کے جوش میں لکھ دیا ہے اگر کہیں کمی یا زیادتی ہو تو معاف کرنا۔ شاد باش۔ زندہ باش۔

عبدالرحمٰن

(۵)

لندن،

۱۴ مارچ ۱۱ء

برادر حبیب من!

خیریت نامہ شرف صدور لایا۔ عافیت معلوم ہو کر مسرت ہوئی۔

میں بھی زندہ ہوں اور یادِ دوستاں وظیفہ ہے۔

اہلِ قلم اور اہلِ علم اور خدا جانے کیا کیا۔ للہ یہ باتیں نہ لکھا کیجئے۔ مجھے اگر بوجہ نادانی قلم سے کبھی کچھ واسطہ تھا بھی تو اب نہیں ہے، کسی کو بار بار گذشتہ تقصیر پر گرفت کرنا ناانصافی ہے۔ وہ دن گئے کہ میں جاندادۂ ہوائے سر رہگذار تھا۔

جواب مضمون جب مکمل ہو گا حاضر خدمت کر دوں گا۔ استفادہ! میرے جواب مضمون سے کیا استفادہ ہو سکتا ہے، البتہ اگر استفادہ حاصل

کرنے کا نسخہ دریافت ہے تو ذیل میں درج ہے، آزمودہ ہے۔

درخاکِ بالقاں برسیدم بہ عابدے
گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن
گفتا بروچو خاک تحمل کن اے فقیہ
یا ہر چہ خواندۂ ہمہ در زیر خاک کن

ابھی تک کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ کہاں کام شروع کروں گا، علی گڑھ سب سے بہتر ہے مگر میں تو ہزار علی گڑھ کی جانب رجوع کرتا ہوں، علی گڑھ ہی کو میری قربت گوارا نہیں۔

چو بسوئے کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندادند
تو بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

عینک کی بابت ستار صاحب سے استفسار کیا ہے انشاء اللہ دو ہفتے میں روانہ کروں گا۔

ایک نقش اپنا خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ قبول کیجئے۔ اور سب حالات بدستور ہیں۔ آداب۔

عبدالرحمٰن

(۶)

لندن،

۲۰ اپریل ۱۱ء

پیارے بھائی!

شاد باش، زندہ باش، تیرا محبت نامہ ملا جس سے جماعت میں اول آنے کا مژدۂ جاں فزا معلوم ہوا۔ جس قدر خوشی ہوئی بیان سے باہر ہے۔ یہ کامیابی انشاء اللہ آئندہ کامیابیوں کی دلیل ہے اور تیری ہمت، لیاقت اور کوشش اور خدا کی عنایت سے امید ہے کہ اب بفضلہٖ تو ہر امتحان میں سب سے اعلیٰ اور ہر مقابلے میں سب سے بالا رہے گا۔

اپنی صحت اور جسمانی تعلیم کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ اپنے آپ کو کتاب کا کیڑا نہ بنانا۔ میرے پہلے خط پر اوقات فرصت میں غور کرنا اور جہاں تک ہو سکے کتابی تعلیم سے زیادہ عملی تعلیم اور جسمانی تعلیم کی ہدایات کو ضرور عمل میں لانا۔ منتخب اور بڑے لوگ وہی ہوں گے جو جسم اور روح دونوں کا مساوی خیال کریں گے۔ اللہ تعالیٰ تجھے ہمیشہ اپنے سایۂ عاطفت میں رکھے اور اپنی جملہ نعمتیں تجھ پر مبذول فرماوے۔ آمین۔

میں جلد کچھ کتابیں بھیجوں گا۔ مجھ کو ہنوز فرصت نہیں ہوئی، جب

فراغت پاؤں گا تو فوراً تعمیل کروں گا۔

اس خط میں اردو کتابوں کی فہرست روانہ کرتا ہوں جو امید ہے ضروریات کو کافی ہوگی۔

قصص اور افسانوں کا مطالعہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس سے تخیل پیدا ہوتا ہے اور جب علم اور تخیل ہم آغوش ہوں تو اس سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ نہایت خوش گوار ہوتے ہیں۔ اگر صرف علوم صحیحہ کا مطالعہ کیا جائے تو طبیعت میں نشر، خیالات میں انجماد اور زندگی میں سردی پیدا ہو جانے کا خوف ہے۔

تاج محل کیا ہے ایک خیال ہے جس نے ایک صاحب فن اور نیز صاحب تخیل انجینئر کے اعصاب دماغی سے رگ ہائے مرمر میں گزر کیا ہے اور جامد بے جان پتھر کو صورت اور حیات آشنا کر دیا ہے۔

شاعری کیا ہے، اعلیٰ تخیل اور صحیح علم کے اجتماع سعدین کا نام ہے۔

لیکن اگر صرف تخیل ہی سے کام لیا جائے اور توجہ کو ضرورت سے زیادہ قصص اور افسانوں پر صرف کیا جائے تو طبیعت میں کاہلی، خیالات میں انتشار، اور زندگی میں بے جا حرارت پیدا ہو جانے کا خوف ہے۔

چنانچہ طالب علم کا فرض ہے کہ قصص اور افسانوں میں پوری دلچسپی

لے، اُن سے تخیل کی صفت حاصل کرے مگر تخیل کو اپنے فنِ خاص میں وسعتِ خیال حاصل کرنے کے لئے صرف کرے۔ قصص اور افسانے حسبِ ذیل تجویز کرتا ہوں۔

الف لیلہ۔ اس کتاب کی خوبی کی یہی کافی شہادت ہے کہ ایشیا اور یورپ کی جملہ زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہے۔

فسانۂ عجائب۔ مصنفہ رجب علی بیگ سرور لکھنوَ۔ اس کا قصہ دلچسپ ہے۔ زبان اچھی ہے۔ محاورہ میں ڈوب کر لکھا ہے اور خوب تحریر ہے۔ لحاظ رہے کہ بعض محاورات قدیم ہیں جو اب متروک ہیں۔

قصۂ ممتاز۔

چہار درویش۔ مصنفہ میر امن دہلوی۔ معروف ہے۔

قصص ہند، ہر دو حصے۔ مصنفہ مولوی محمد حسین آزاد۔ زبان قابلِ غور اور لائقِ تقلید ہے۔

رسومِ ہند اور رسومِ دہلی مصنفہ مولوی سید احمد دہلوی۔ زبان خاصی ہے۔

ناول پڑھنا اس وجہ سے ضروری ہیں کہ ان سے موقع کشی کا علم حاصل ہوتا ہے اور زندگی کے واقعات سے آگاہی ہوتی ہے۔ نیز ان میں سے چند عمدہ زبان کا نمونہ ہیں اور جب تک عمدہ زبان کا مطالعہ نہ کیا جائے

عمدہ زبان لکھنا ممکن نہیں۔

یہ خیال کہ ناول مخرب اخلاق ہیں، غلط ہے لیکن اگر پڑھنے والے کو محسوس ہو کہ ایسا ناگوار اثر اس کی طبیعت پر پڑ رہا ہے تو اُن کا ترک واجب ہے۔ اس اثر کا باعث غالباً ناولوں کا غلط انتخاب ہے۔ ذیل کی کتابیں ایک سلیم الطبع طالبِ علم کے لئے موزوں ہیں۔

منصور موہنا۔ عبدالحلیم شرر

بہشت بریں۔ ایضاً

ملک العزیز ورجنا ایضاً

حسن انجلینا ایضاً

نیل کا سانپ محمد علی طبیب

گورا۔ محمد علی طبیب

توبۃ النصوح۔ نذیر احمد دہلوی

مراۃ العروس۔ ایضاً

بنات النعش۔ ایضاً

منازل السائرہ۔ راشد الخیری

زہرا۔ سید سجاد حیدر

ثالث بالخیر۔ سید سجاد حیدر
کائنات۔ سید سجاد حسین لکھنوی
ہاجرہ۔ مترجمہ محمد حسین
کنیز فاطمہ۔ قاضی عزیز الدین

شاعری کا مطالعہ بھی ضروری ہے کیوں کہ یہ بمنزلہ غذائے روحانی کے ہے اور سخت مطالعے کے بعد اس کا شغف دماغ میں سکون پیدا کرتا ہے۔ یہ افسوس ہے کہ اردو شاعری اپنے مضامین میں محدود ہے مگر باوجود اس کے بحیثیت شاعرانہ وصف اعلیٰ پایہ رکھتی ہے۔ کتابیں یہ ہیں:

آبِ حیات۔ محمد حسین آزاد
گلشنِ بے خار۔ شیفتہ
خُم خانۂ جاوید۔ سری رام
تذکرۂ شعراء۔ گارسان دی تاسی

کلیاتِ میر:۔ اس میں اعلیٰ درجے کی شاعری اور زبان ہے جس کی لطافت اور خوبی کو جملہ اساتذہ نے تسلیم کیا ہے۔

دیوانِ غالب :۔ یہ دنیا کی شاعری جدید اور قدیم میں ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اس کے تخیل کی پرواز اور اس کی شاعرانہ

خوبی کو قدیم ہندوستان، ایران اور جدید یورپ کے شعراء
بھی نہیں پا سکے۔ مشکل ہے۔ ہنوز صرف ناظرہ یعنی بے
معنی سمجھے پڑھنا کافی ہے۔

شرحات یہ ہیں:۔

از علی حیدر طباطبائی۔ از فضل الحسن حسرتؔ۔ از شوکت
میرٹھی۔ مگر ہنوز ان کا دیکھنا مناسب نہیں۔

کلیاتِ انیسؔ:۔ اسکا مطالعہ بھی ضروری ہے کیونکہ اس میں
واقعاتِ شہادت کا بیان ہونے کے باعث ایک خاص
مضمون اور تسلسل ہے

موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ۔ مصنفہ شبلی۔

مثنوی میر حسنؔ، مثنوی گلزارِ نسیم، ہر سہ مثنویات میر۔

قصائدِ ذوقؔ۔ دیوان کا بقیہ حصہ غیر ضروری ہے۔

دیوانِ حالیؔ:۔ اس کا مقدمہ فن شاعری اور اردو شاعری پر زبانِ
اردو میں سب سے اعلیٰ پائے کی تنقید ہے۔

مسدسِ حالیؔ:۔ زمانۂ حال کی دنیا کی بہت بڑی کتابوں میں اعلیٰ
پایہ رکھتی ہے۔

بقیہ کلام حالؔی

کلامِ اقبالؔ

دیوانِ وحشتؔ:۔ مرزا غالبؔ کے طرز پر شعر کہنے کی کوشش کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔

کلیاتِ اکبرؔ:۔ عمدہ مذاق کا نمونہ ہے۔

علم تاریخ کے مطالعے سے زمانہ گذشتہ کا حال معلوم ہوتا ہے، اپنے آباء واجداد کے کارنامے دریافت ہوتے ہیں اور اسلاف کی عظمت وشوکت سے واقفیت ہوتی ہے۔ نیز مذہبی واقفیت بہم پہنچتی ہے۔

خطباتِ احمدیہ۔ سرسید احمد خاں

الفاروق۔ شبلی۔ علامہ موصوف کی سب سے زبردست اور اہم تصنیف اور جناب خلیفہ ثانی کی زندگی کا مرقع ہے۔

المامون، تذکرۃ النعمان، رسائل شبلی، سوانح مولانا روم، علم الکلام۔

المدنیۃ والاسلام۔ مذہبی کتاب ہے۔

حیات جاوید، یادگار غالبؔ، حیات سعدیؔ۔

چند کتابیں ایسی ہیں جو کسی خاص صنف میں داخل نہیں ہیں۔ ان کو یہاں علیحدہ مختلف مضامین کی مد میں لکھتا ہوں۔

تہذیب الاخلاق۔

مواعظ (لکچرز) سرسید احمد خاں۔ مواعظ محسن الملک۔

فلسفہ تعلیم۔ مترجمہ غلام الحسنین۔

حکمت عملی۔ مصنفہ سجاد حسین بیگ۔

خیالستان۔ مصنفہ سجاد حیدر

تحریر المراۃ:۔ ترجمہ از قاسم امین بے۔

مگر باوجود اس قدر مطالعے کے زبان سے پوری واقفیت نہ ہوگی جب تک کہ قواعد کا مطالعہ نہ کیا جائے اور قواعد کا سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ استاد کی توجہ اور مدد حاصل نہ ہو۔

قواعد میں یہ کتابیں عمدہ ہیں۔ ابتدائی قواعد اردو۔ قواعد اردو، فتح محمد جالندھری، قواعد اردو، عبدالحق حیدر آبادی۔

علم البیان جس پر صوفیہ کی شاعری مبنی ہے اور علم العروض دونوں توجہ کے مستحق ہیں۔ دو ایک رسالوں کا دیکھنا کافی ہے مگر استاد کی مدد لازمی ہے۔

عمدہ کتابت کی مشق بہم پہنچانے کے لئے انشاء کی طرف توجہ مبذول کرنا بھی ضروری ہے۔ انشاء کی یہ کتابیں ہیں:

اردوئے معلیٰ غالبؔ

عودہندی   غالبؔ

موعظۂ حسنہ   نذیراحمد

رقعات سید احمد خاں۔

جہاں تک مجھے معلوم تھا میں نے لکھ دیا۔ الانسان مرکب الخطاء والنسیان۔

ایک اور ضرورت ہر طالب علم کو عمدہ لغات کی رہتی ہے۔ ہماری زبان میں فرہنگ آصفیہ صرف ایسی لغات ہے جو قابل اعتماد اور صحیح کہی جاسکتی ہے۔

اب اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔ ہمیشہ تیرے خط کا منتظر اور تیری اور سب کی خیریت کا طالب ہوں۔ تیری اعلیٰ کامیابی پر پھر از حد مسرت کا اظہار کرتا ہوں۔ آئندہ بھی انشاءاللہ جو مفید سمجھوں گا اس سے اطلاع دیتا رہوں گا۔

حضور امی جان مکرمہ مدظلہا کی خدمت میں دست بستہ آداب عرض ہے۔ اور سب کو ماوجب۔ والدعا۔

عبدالرحمٰن

(۷)

لندن،

۳۰جون ۱۱ء

پیارے دوست محسن صاحب!

پس از ابلاغ مراسم نیاز مندی وشرح آرزو مندی، صحیفہ گرامی دال بر عافیت مزاج وہاج اور سلامتی احباب صادر ہوا اور حصول اس کا باعث ابتہاج۔

آپ کی شکایت کہ ''عمریست کہ منتظر خبر ہستم'' سے استعجاب ہوا۔ اگر اس کا مطلب صرف یہی ہوتا کہ ہجر میں اوقات زلف کی طرح طویل ہوجاتے ہیں تب تو صرف آپ کی محبت پر محمول کرتا مگر یہ بھی تو تحریر ہے کہ میں نے والا نامہ گرامی کا جواب نہیں دیا۔

اب جہاں تک فرسودہ دماغ پر زور ڈالتا ہوں خیال ہوتا ہے کہ اسی میز پر اسی طور نشستہ ایک خط قبل ازیں بجواب خط عالی لکھ چکا ہوں، مگر جب پہنچا ہی نہیں تو لکھا بے لکھا ایک ہے، اس لئے معافی کا طالب ہوں۔

آپ کی کوششوں کی اطلاعات شفقت صاحب کے ذریعہ ہوچکی ہیں، خدا آپ کو اور احباب کو ایسے موقعے دے کہ وہ سعی ہائے مشکور

ثابت ہوں۔

اے دوست عزیز اور رفیق!

یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص خار بیاباں بوئے اور سرسبز گیاہ کے تختوں پر چلے۔ جس چیز کی ابتدا خوشامد سے ہے، جس کے شیرازے کی بندش ذاتی منفعت کے اصولوں پر ہے اس کا کم وبیش یہی انجام لازمی ہے، مگر ''قوم'' کو اپنی آزادی کی کوشش جاری رکھنی چاہئے۔ قوم کی آئندہ جنگ رہبران قوم سے ہے۔

زدوست غیر من ہرگزنہ نالم
کہ بامن ہر چہ کرد آں آشنا کرد

خدا کرے کہ آخری صورت آئین کی کسی نہ کسی طور معقول، کم از کم غنیمت نکل آوے۔

بھلا کہیں یونیورسٹیاں یوں جنبش قلم شاہی سے بنی ہیں؟ ہتھیلی پر سرسوں جمانا اور اپنی شعبدے بازی سے دنیا کو حیران کرنا اسی کو کہتے ہیں۔

مگر میں اس خیال سے خوش ہوں کہ وہ جو ایک مثالہ خواہ مخواہ سدراہ ہوگیا تھا وہ مٹ جائے گا۔ ایک خیال پیدا ہوگیا تھا کہ جس دن یونیورسٹی بنے گی امام مہدی خود ''چارٹر'' لے کر آدیں گے۔ پھر کیا تھا تمام دنیائے اسلام

نشہ علم میں چور سر یرآرائے عالم ہوگی، قرطبہ اور بغداد کے نقشے آنکھوں میں پھر جاویں گے بلکہ نئی روشنی میں ماند پڑ جاویں گے۔

عنقریب اگر امام مہدی نہیں تو ''امام حاضر'' چارٹر لے کر حاضر ہوا چاہتے ہیں، مگر قرطبہ اور بغداد کے مزاروں کے سونے والے شاید ہی اس نئے علمی محشر کی آواز سے جاگیں۔ انہیں تو کیا خبر ہوگی مگر ہم ضرور جاگیں گے کہ وہ خیال ایک خواب تھا۔

شاید اس کے بعد توجہ کسی اور طرف ہو اور کوئی شارع تلاش کی جائے، سکون سے جنبش بہتر ہے۔

جغرافیہ یاد ہے؟ ذرا جرمنی پر یورپ میں اور ہند پر ایشیا میں نگاہڈالنا، اگر حیدرآباد اور جرمنی کو یوں رکھو جیسے اقلیدس کی کتاب الاول میں شکل ۶ کی مثلثیں ایک دوسرے پر رکھی جاتی ہیں تو مقراض کو حیدرآباد ہی کی گوشہ تراشی لازم آئے گی۔

اس جرمنی میں بائیس یونیورسٹیاں ہیں۔ برلن میں پانچ سو پروفیسر اور دس ہزار طالب علم ہیں اور کہیں بھی سو سے کم پروفیسر اور تین ہزار سے کم طلباءنہیں۔

کیا ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک یونیورسٹی کافی ہو

جاوے گی؟

تمہاری کیا رائے ہے؟

امید ہے کہ نتیجہ امتحان حسب المراد نکل آیا ہوگا۔ مجھے پرسوں کی ڈاک سے اطلاع ہونے کی امید ہے اس لئے اظہار مبارکباد کو تا آں ملتوی کرتا ہوں۔

میرے اشغال کچھ قابلِ بیان زیادہ نہیں کیوں کہ کچھ ہیں ہی نہیں۔ جرمنی گیا تو ہوں دیکھنا یہ ہے کہ رہ بھی سکتا ہوں یا نہیں۔ دوسرے بیرسٹری ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

صحت کے متعلق جو دریافت فرمایا ہے سو اس کے ہاتھوں چین ایکدن نہ پایا، یہ جان ہے بدن میں یا خار پیرہن میں۔

کن لوگوں سے ملا ہوں؟ مختلف طور سے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

علی گڑھ کالج کے جملہ طلباء سے کم و بیش ملاقات ہوجاتی ہے۔ بفضلہ سب اپنے کام میں مصروف ہیں۔ سید محمود صاحب عنقریب واپس ہوجاویں گے۔ تصدق نصف امتحان پاس کر چکے ہیں۔ سید راس مسعود قوم کی جملہ امیدوں کو اپنی لیاقت اور ذاتی خوبی سے پورا کریں گے، یہاں کے جملہ طالب علموں میں بہترین نمونہ ہیں، یہ بہت خوشی کی جا ہے۔

اب تک کسی جلسے یا پارٹی وغیرہ میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا، اس لئے کیا مشاہیر اسلام اور کیا سابق مشاہیر مدرسۃ العلوم کسی کو اب تک نہیں دیکھا۔

عیسائیوں، یہودیوں، کیتھولک، پروٹسٹنٹ سب خاندانوں میں کم وبیش رہا ہوں۔ انسان سب ایک ہیں، سب میں ایک ہی طرح کی خوبیاں اور عیب موجود ہیں۔

انگریزوں اور جرمنوں سے خاصی طور پر واقف ہوگیا ہوں۔ جرمن پروفیسر منہ چوم لینے کے قابل ہیں، طبقۂ خواتین میں کم مگر ملاقاتیں ضرور ہوئی ہیں۔ بہت مُعزّف ہوں۔ بدرالدین صاحب سے کہہ دیجئے کہ جھجک پر وہ قائم ہے ترقی نہیں ہوسکتی۔

بدرالدین صاحب اور ظہیرالدین صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ امید ہے کہ ہر دو حضرات بہ خیریت ہوں گے۔ اور کیا عرض کروں، ہمیشہ آپ لوگوں کے لئے دعا گو ہوں اور خیریت اور عافیت کا طالب۔

انگلستان میں ڈنرز کی حاضری کے باعث آیا تھا۔ یہ عریضہ لکھ کر جرمنی، فرائی برگ (بادن) جاتا ہوں۔ کبھی کبھی یاد فرمالیا کیجئے۔ کیا کہوں خط

لکھنے میں مجھے ایسا تساہل ہے کہ دوست جو بھی کہیں بجا ہے، مگر پھر بھی دوست وہی ہیں جو عفو سے کام لیتے ہیں۔

اگر خط طویل یا حقیر ہے تو معافی چاہتا ہوں۔

خیریت کا طالب

کمترین عبدالرحمٰن

(۸)

اسلامبول،

۲۱ اگست ۱۹۱۱ء

عالی حضور، قبلہ و کعبہ ام، مکرم و محترم مدظلہ العالی۔ آداب۔ دست بستہ گذارش ہے۔

الحمدللہ کہ دم تحریر میں مع الخیر ہوں اور امید ہے کہ بحصول عرضیہ مزاج عالی بسلامتی ہوگا اور جملہ خورد و کلاں بہ خیریت ہوں گے۔

ہنوز گذشتہ دو ہفتوں کی ڈاک نہیں آئی، کل ملے گی مگر امید ہے کہ بفضلہٖ تعالے بہمہ طور خیریت مندرج ہوگی۔

اب میں بہ آرام ایک ترکش مسلمان ہوٹل میں مقیم ہوں اور اسلامبول میں جو مسلمانوں کا خاص حصہ ہے رہتا ہوں۔

قسطنطنیہ نہایت خوبصورت مقام ہے۔حقیقت میں ایسا قدرتی منظر دنیا کے کسی شہر کے حصے میں نہیں آیا۔یورپ کے مقابلے میں شہر عام بلحاظ عمارات اور صفائی وغیرہ کے بہت پسماندہ حالت میں ہے۔اول تو اس کی یہ وجہ ہے کہ یورپ کی دولت کا عشر عشیر بھی یہاں نہیں۔ دوسری سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں جہاں اور تمام مظالم روا رکھے گئے ہیں وہیں اس طرف بھی عدم توجہی کی گئی ہے۔اب چار سال سے شہر کی درستگی ہو رہی ہے مگر اس کے لئے کم از کم بیس سال درکار ہیں۔ ہندوستان کے شہروں کے مقابلے میں شہر بہت عمدہ ہے۔

ترکوں کی زندگی نہایت پاک مسلمانانہ اور سادہ ہے۔ یورپ کے تعیش اور پر از فسق و فجور تمدن کے مقابل میں اس کو دیکھ کر باوجود زوال، اسلام کی اندرونی خوبی ظاہر ہوتی ہے۔

بلحاظ لباس ترک مغربی ہیں، بلحاظ عادات ایشیائی۔مگر ایسے مہمان نواز اور ایسے خلیق لوگ اس وقت روئے زمین پر کہیں نہ ایشیا میں اور نہ یورپ میں موجود ہیں۔اخوت اسلام کا سبق سیکھنے کے لئے قسطنطنیہ سے بہتر کوئی مدرسہ نہیں ہے۔

عورتیں تمام ''یشمک'' پہن کر نکلتی ہیں۔ چوں کہ عورتوں کا لباس بھی

مغربی ہے اُس کے لحاظ سے ایک سیاہ یا کسی اور ریشمی کپڑے کا ایک بیرونی لباس جسم کی کیفیت کو چھپانے کے لئے پہنتی ہیں اور منہ پر باریک سیاہ نقاب ہوتا ہے جس میں سے چہرہ قریب سے جانے پر نظر آتا ہے۔ تمام کاروبار خانہ داری عورتیں خود کرتی ہیں۔

ترک زن و مرد سب نہایت خوبصورت لوگ ہیں۔

باد جود ترکوں کے مرنجاں مرنج ہونے کے یورپ اُن کو مسلمان ہونے کے جرم میں ذرا چین نہیں لینے دیتا۔ ہر ملک ان کا دشمن اور دولت عثمانیہ کی تقسیم کے درپے ہے اس لئے سلطنت مشروطہ نے سب سے پہلے اپنی توجہ فوج کی درستی کی طرف مائل کی ہے اور میں جس نے جرمن فوج کو جو دنیا کا بہترین عسکر ہے دیکھا ہے کہہ سکتا ہوں کہ ترک فوج بھی اس سے کم نہیں۔

اگر کسی دن ترکوں کو ان درندہ صفت دشمنوں کی مجموعی طاقت سے بھی لڑنا پڑا تو دنیا دیکھ لے گی کہ ترک یورپ سے اہل مغرب کے خون کے ایک سیلاب عظیم پر واپس جادیں گے اور یورپ کا جغرافیہ اور تاریخ بھی نیز منقلب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

ترکوں اور دولت عثمانیہ کی حالت اس وقت مذکورہ بالا وجہ سے نازک

ہے لیکن اگر ترک دس سال رہ گئے تو انشاء اللہ پھر کوئی طاقت ان کے سامنے نہ آ سکے گی۔ اس وجہ سے جب کبھی کسی قسم کی اصلاح سلطنت میں ہوتی ہے تو یورپ اس کے مانع آتا ہے اور اپنی دشمنی کا آشکارا اور پنہاں اظہار کرتا ہے۔

مسلمانان عالم کا یہ فرض ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے ملک اور اپنی قوم تک کو بھول جاویں اور دولت عثمانیہ کی امداد کریں۔ اگر سلطنت عثمانیہ آج بچ رہی تو مسلمانوں کا مستقبل بہت عالیشان ہوگا اور اگر خدانخواستہ یہ نہ ہوا تو مسلمان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جاویں گے اور قعر ذلالت سے کبھی نہ ابھر سکیں گے۔

اور حالات اس وقت عرض نہیں کرتا۔ اگر ہو سکا تو کسی اخبار میں اُن کو شائع کراؤں گا اور آپ کو اطلاع دوں گا۔

اور سب حالات بدستور ہیں۔ ہمیشہ سب کی خیریت مطلوب ہے۔

حضور امی جان مکرمہ مدظلہا کی خدمت میں دست بستہ آداب عرض ہے۔

اور سب کو ما وجب۔ زیادہ حد ادب

عبدالرحمٰن

(۹)

دارالسعادت،

۳ ستمبر ۱۲ء

عالی حضور قبلہ و کعبہ ام مکرم معظم مدظلہ العالی،

بعد آداب دست بستہ گزارش ہے والا نامہ گرامی شرف صدور لایا نیز پارسل کلام اللہ شریف کا بحفاظت موصول ہوا۔ صحیفۂ سامی سے سلامتی مزاج وہاج اور خیریت متعلقین دریافت ہو کر اطمینان حاصل ہوا اور خوشی ہوئی۔ خرچ کے متعلق جو تحریر فرمایا ہے کہ ہفتہ ابتدائے ستمبر میں پہنچے گا، غالباً آئندہ یا اس سے آئندہ ڈاک میں آجاوے گا، میرے پاس ابھی کچھ خرچ باقی ہے اس لئے اس باعث کوئی تکلیف نہیں، اطمینان کے لئے لکھتا ہوں۔

مسٹر بدرالدین کے کوئٹہ آنے کا حال معلوم ہوا۔ امید ہے کہ بہمہ وجوہ بخیریت ہوں گے۔ اُن کی ناکامیابی سے رنج ہوا، آئندہ سال اللہ تعالیٰ نمایاں کامیابی عطا فرماوے۔ روشن آرا کے مزاج کی کیفیت پیشتر سے بہتر سن کر گونہ اطمینان ہوا۔ شافی مطلق اپنے حبیب کے طفیل کلی آرام عطا فرماوے۔ بشیرالدین کی جانب سے ویسا ہی تفکر ہے، اللہ تعالیٰ رحم و کرم فرماوے اور صحت بخشے۔

زہرہ بیٹی کی خیریت سے اطمینان ہوا۔ چنومیاں کے مڈل کا حال دریافت ہوکر خوشی ہوئی، مبارک باد۔ چنومیاں نے دو خط طلب کئے ہیں، ایک مولوی عبداللہ صاحب کے نام دوسرا ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے نام مولانا ممدوح کے نام میرے عریضے کی ضرورت نہیں؛ بغیر اس کے بھی مولانا موصوف ہر طرح کی توجہ فرمادیں گے صرف ان سے عرض مدعا کافی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نام ایک خط ملفوف ہے۔ چنومیاں کو چاہئے کہ اس کو بند کر کے علی گڑھ میں خود ڈاکٹر صاحب کو دیں۔ اگر چنومیاں کو اور کسی بات کی ضرورت ہوگی تو مسٹر بدرالدین امید ہے اُس کا بندوبست کردیں گے۔

یہاں کے حالات وغیرہ کیا عرض کروں، ہوسکے گا تو کچھ شائع کروں گا۔ البتہ آپ کی اطلاع کے لئے یہاں کی سیاسیات سے مطلع کرتا ہوں۔ مجھے سحا قبلو ہز ہائنس شیخ الاسلام جمال الدین آفندی کی خدمت میں باریاب ہونے کا بھی موقعہ ملا تھا۔ علاوہ ازیں یہاں کے بہت سے سربرآوردگان سے ملا ہوں۔ خلیل خالد بے اور علی حیدر مدحت بے مشہور مصنفین سے چند بار ملا۔ اڈیٹر ''طنین'' ''سبیل الرشاد'' ''الہلال'' وغیرہ سے ملا۔ فوجی افسروں سے ملا، اتحاد و ترقی اور حریت و ائتلاف دونوں فریق کے لوگوں سے ملا۔ قصہ مختصر کیفیت یہ ہے:

ملک میں اس وقت صرف ایک وطن پرست اسلام دوست جماعت ہے اور یہ انجمن اتحاد وترقی (Union & Progress) نامی ہے۔اس کے علاوہ جتنے فریق ہیں سب (الا ماشااللہ) یورپی دول کے وظیفہ خوار اور ان کی جانب سے اس اسلامی حکومت میں فساد پھیلانے کے تنخواہ دار ہیں۔

یہ دشمن ملک و مذہب لوگ کون ہیں؟ وہ رشوت خور اور Corrupt لوگ جن کو انجمن اتحاد وترقی نے برسر کار ہوتے ہی چن چن کر نکال دیا تھا، وہ پاشا جو استبداد میں رعایا کے گھروں کو کھلے خزانے کو لوٹتے تھے، وہ مولوی اور سوفتے جن کے ہم معنی لوگ ہمارے ملک میں بہت موجود ہیں۔

البانیہ کا فساد کیا ہے؟ یہ ہے کہ یہ لوگ سخت جاہل مسلمان ہیں اور آسٹریا اور اٹلی سے روپے۔۔۔کروڑوں روپے۔۔۔فساد مچانے اور بے امنی برپا رکھنے کے لئے پاتے ہیں۔

کمیٹی یونین اور پروگرس (انجمن اتحاد وترقی) نے جس کے روح رواں مارشل محمود شوکت پاشا ہیں سب سے پہلا کام جو کیا ہے وہ فوج کی اصلاح ہے اور اس وقت عسکر کی مثال تیغ براں کی ہے جو جس دشمن کی گردن پر پڑ جاوے گی تسمہ باقی نہ چھوڑے گی۔دوسرا کام کمیٹی نے اجراء تعلیم کا کیا ہے اور چار سال میں تین سو مدرسے نئے جاری کئے ہیں۔

جب یورپ کی دول نے ۔۔۔۔ میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا ۔۔۔
یہ دیکھا تو اسلام کی بیداری سے طبعی دشمنی اور اقتضاء دشمنی رکھنے کے باعث اٹلی کو بھڑکا کر آمادۂ جنگ کر دیا اور تمام عہد ناموں، قوانینِ بین الاقوام اور انسانیت کے خلاف مصر کے راستے کو ترکی فوج کے لئے بند کر دیا۔

دوسری جانب تمام بلقان کی ریاستوں کو بھڑکا رہے ہیں۔ چنانچہ سرویا (Serbia) میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا ہے۔ سرحدِ یونان پر یونانی اور ترکی سپاہیوں میں کشت وخون ہو چکا ہے اور قرہ طاغ (Montenegro) میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ البانیوں کو آمادہ فساد کرنے کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے اور اسلحات مفت مہیا کئے جا رہے ہیں۔

خدا کی شان کہ طرابلس میں اٹلی سے اب تک کچھ نہیں بنا ہے اور اگر جنگ قایم رہی تو بالاخر اٹلی کو شکست ہو جائے گی۔ یہ خاص وجہ ہے ریاست ہائے بلقان مذکورہ بالا کو بھڑکانے کی، تا کہ اس طور دولت عثمانیہ پر خارجی دباؤ ڈالا جائے۔ علاوہ ازیں اٹلی کو بھڑکا رہے ہیں کہ خانۂ کعبہ پر چڑھائی کرے تاکہ ترک صلح کرنے کے لئے مجبور ہو جاویں۔

داخلی طور پر دول یورپ اور اس کے نمک حرامِ ملک وملت تنخواہ دار اور وظیفہ خوار بالاخر اس بات میں کامیاب ہوئے ہیں کہ انجمن اتحاد وترقی کی

کابینہ Cabinet برطرف ہو چکی ہے اور مجلس (Parliament) برخاست کردی گئی ہے۔شوکت پاشا مستعفی ہو گئے ہیں۔

اس وقت جو اہل کابینہ Cabinet برسرکار ہیں ان میں سے بیشتر غیر طرفدار لوگ ہیں یعنی انجمن اتحاد وترقی یا کسی اور جماعت یا فریق ملکی سے تعلق نہیں رکھتے مگر ان کی سیاست اور تدبیر طاقت سے خالی اور ضعیف ہے۔ ان کی مثال ہمارے ٹرسٹیان کالج کی سی ہے جو کسی کام کو جس میں جرأت درکار ہو کرتے خائف ہوتے ہیں۔ دو ایک جو جری طبیعت ہیں اس کابینہ سے نکلنے والے ہیں یا نکل چکے ہیں۔

اس کابینہ میں ایک بزرگ ہز ہائینس کامل پاشا ہیں جن کو انگریز Grand old man of Turkey کہتے ہیں مگر جتنا ان کا اقتدار انگلستان میں ہے یہاں لوگ ان کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ دھرتے اور لاحول پڑھتے ہیں۔ یہ ملک کے قابل ترین اور بدترین شخص ہیں۔

یہ اور ان کے خارجی یورپی مؤید اس کوشش میں ہیں کہ یہ وزیر ہو جاویں۔ ان کی وزارت کے معنی اٹلی سے بے عزتی کی صلح اور اس سے بھی کچھ زیادہ مصیبت کے ہیں۔

اب اگر انجمن اتحاد وترقی ان کے اور اپنے اور تمام مخالفوں کے

خلاف جنبش کرے تو وم زون میں اسی شارع پر جو میری کھڑکی سے نظر آتی ہے خون بہتا ہوا نظر آئے اور ملک میں اندرونی فساد پھیل جائے۔ اس لئے محمود شوکت پاشا گوشہ نشیں ہیں اور انجمن اتحاد و ترقی کے اراکین خون کا سا گھونٹ پی کر خاموش ہیں۔

رمضان شریف کے ختم ہونے کا انتظار ہے۔ عید کے دوسرے روز انتخابات Election شروع ہوں گے۔ اس وقت تک کامل پاشا اور اس کے مؤیدین موجودہ کابینہ کے ذریعے سے کچھ نہ کر سکے اور اہل انجمن اتحاد و ترقی کا غلبہ ہوا اور وہ برسر کار ہوئے تو امید ہے کہ سب کچھ درست ہو جاوے گا۔ ورنہ اللہ علیم ہے اور اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے۔

اگر انجمن اتحاد و ترقی کا دور پھر آیا۔۔۔ اور ملک کے لئے یہی ایک نجات کی امید ہے۔۔۔ تب بھی مارشل شوکت محمود پاشا کچھ عرصے تک برسر کار نہ آئیں گے مگر انشاء اللہ کچھ عرصے بعد پھر دنیا ان کی مدح کناں ہوگی۔ یہ اس ملک کے بسمارک ہیں، اگر ان کو موقعہ مل گیا تو یہ وہ کام کر جائیں گے کہ ان کے کارنامے آئندہ نسلوں کے لئے یادگار رہوں گے۔

اس وقت تمام دنیا کے مسلمانوں کا مستقبل دولت عثمانیہ کے عروج و زوال پر منحصر ہے اور دولت عثمانیہ کا عروج انجمن اتحاد و ترقی کی جان مارشل

شوکت پاشا پر ہے۔

ان سب امور کے علاوہ ایک بڑی مشکل اور مصیبت یہ ہے کہ روپیہ نہیں ہے اور قرض ملتا نہیں لیکن ساتھ ہی اٹلی کے پاس بھی روپیہ نہیں ہے۔ اس میں دونوں ایک ہی کشتی میں ہیں۔ اللہ پر آسرا اور بھروسہ ہے۔ نصر من اللہ وفتح قریب۔

یہ اصلی کیفیت ہے مگر یہ باتیں کسی اخبار میں لکھنا خلاف مصلحت ہے کیوں کہ ان سے لوگوں میں اختلاف پیدا ہونے کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ صرف آپ کی اطلاع کے لئے لکھتا ہوں۔

امید ہے کہ بحصول عریضہ خیریت ہوگی۔ حضور امی جان مکرمہ مدظلہا کی خدمت میں دست بستہ آداب عرض ہے۔ اور سب کو ماو جب پہنچے

عبدالرحمٰن

(۱۰)

دارالسعادت،

۱۴ ستمبر ۱۲ء

عالی حضور قبلہ وکعبہ دام ظلکم العالی

دست بستہ آداب گذارش ہے۔ صحیفہ سامی شرف صدور لایا اور

احوال وکوائف مندرجہ سے آگاہی ہوئی۔ سلامتی مزاج وہاج دریافت ہو کر اور جملہ خورد وکلاں کی خیریت سن کر اطمینان قلب حاصل ہوا اور مسرت ہوئی۔ الحمد للہ میں مع الخیر ہوں۔ جیسا گذشتہ عریضے میں عرض کر چکا ہوں ہنڈی مبلغ یک صد پونڈ کی موصول ہوئی۔ اس کا دوسرا شنی بھی پہنچ گیا۔ پارسل قرآن شریف کا بھی گذشتہ ہفتہ درست پہنچ گیا۔

بدرالدین کا روشن آرا کو ہمراہ لے جانے کا حال دریافت ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کا محافظ اور معاون ہو۔

قسطنطنیہ کے مسلمانوں کے متعلق انشاء اللہ کچھ حالات کسی اخبار میں تحریر کروں گا۔ جب واپسی پر اس کی تکمیل کر سکوں گا تو اطلاع دوں گا۔ یہاں صرف آپ کی اطلاع کے لئے کچھ عرض کرتا ہوں۔ مجھے اب یہاں رہتے ایک ماہ سے زائد عرصہ ہو چکا ہے اور وزراء سے لے کر حمالوں تک سے ملنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔ ترکوں کی سیاسی زندگی کے متعلق گذشتہ عریضے میں مختصر بیان کر چکا ہوں۔ اس میں ان کی اقتصادی کیفیت اور تجارتی حالت پر کچھ لکھتا ہوں۔

ترک جب سے یورپ میں آئے فتوحات یا دشمنوں کی مدافعت اور مقابلے میں ایسے مشغول رہے کہ ان کو اور جوانب اپنی توجہ مبذول کرنے کی

مہلت ہی نہیں ملی۔ چنانچہ خلفائے بنی عباس یا حکومت اندلس کی طرح انہوں نے علوم وفنون کی طرف کوئی ایسی توجہ نہیں کی جس سے بحیثیت ایک علمی قوم ان کا نام قائم ہوتا۔ علاوہ بریں یہ تجارت اور صنعت کی طرف بھی جانے کی مہلت نہ پا سکے۔ ہر زمانے میں ان کی عیسائی رعایا ان سے زیادہ تھی اور مسیحی مغربی قومیں گو مغلوب ہوگئی تھیں لیکن اپنے موقع کی ہر وقت منتظر تھیں۔ ایسی صورت میں قرون وسطیٰ اور گزشتہ صدی سے قبل تک زیادہ قباحت نہ تھی کیوں کہ حکمرانی کا دائرہ سیاسیات تک محدود تھا۔ حکومت میں تجارت اور اقتصادیات کو دخل نہ ہوا تھا مگر ایک صدی سے جب کہ مغربی اقوام نے جہاز رانی کے فن کو وسعت دی اور دنیا کے انجانے سمندروں میں داخل ہو کر ہندوستان، ممالک ایشیا اور امریکہ تک پہنچ گئیں سلطنت کی صورت ہی بدل گئی۔ اب سلطنت نام ہے تجارت اور دولت کا۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر یہ نتیجہ ہوا ہے کہ باوجود اپنی دلیری اور شجاعت میں روز افزوں ترقی کرتے رہنے کے ترک جو ہمیشہ نامفتوح تھے یورپ سے مغلوب ہوگئے۔ شجاعت ہے، دلیری ہے، ہمت ہے، جواں مردی ہے ماشاءاللہ یورپ میں جرمنوں کے بعد سب سے عمدہ فوج موجود ہے، لیکن اگر ملک میں اندرونی فساد ہو تو ریل نہیں جس کے ذریعے فوج وم زدن میں اس

مقام تک پہنچ سکے، تاخیر ہونا لازمی ہے۔ ریل اس وجہ سے نہیں کہ ملک میں ایسے تاجر نہیں جو مشترکہ کمپنی سے ریل بنا سکیں۔ تجارت کے محاصل نہیں جس سے گورنمنٹ خود دولت مند ہو کر بنا سکے۔ اگر طرابلس میں فوج کو لے جانا چاہتے ہیں تو بیڑہ نہیں۔ بیڑہ اس وجہ سے نہیں کہ سلطنت صرف حکومت کرتی ہے، تجارت نہیں کرتی۔ نہ رعایا کے پاس دولت نہ خزانے میں روپیہ ہے، سلطان عبدالحمید خاں کے جواہرات پیرس میں فروخت کئے تھے جس سے چار پانچ Destroyers چھوٹے جنگی جہاز بنانے کے لائق روپیہ مل گیا تھا وہ جنگ طرابلس میں خرچ ہو گیا۔ بیڑے کے بنانے کا خرچ اس قدر ہے کہ ہماری محمڈن یونیورسٹی کے تمام اثاث البیت سے مع تمام جمع شدہ روپے کے ایک جہاز جنگی تیار نہیں ہو سکتا۔ اب اس کا علاج کیا ہے؟ صرف وقت اور محنت کے ساتھ یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے، فی الحال سوائے تاسف کوئی چارہ نہیں۔ اس وقت جب یہ سطور تحریر کر رہا ہوں بلغاریہ مع اور ریاست ہائے بلقان (سرویا، مانٹینگرو، یونان) آمادہ جنگ ہے۔ اگر ان چار کے ساتھ ان کا حامی اور سرپرست خود روس بھی شامل ہو جاوے تو عسکر عثمانی کے سامنے پانچوں بے حقیقت ہیں مگر جنگ کو جاری رکھنے کے لئے روپیہ نام کو نہیں۔ اب بتایئے کہ اس کا کیا چارہ کار ہے؟ اس میں شک نہیں کہ ریاست ہائے

بلقان خود مفلس ہیں مگر ان کو روپیہ دینے والے موجود ہیں؛ ان کو روپیہ دینے والے ان کی ہمدردی، ان کی آئندہ بہتری، ان کی فتحیابی کے خیال سے روپیہ دیں گے۔ دولت عثمانیہ کو اول تو کوئی روپیہ دینے والا ہی نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو اس قدر حقوق اور رعائتیں حاصل کرنے کے بعد روپیہ دے گا کہ ایسے قرض سے شکست کم مضر ہے۔ غرض نہ جائے ماندن نہ راہ رفتن کا معاملہ ہے۔ آپ ہر روز سنتے ہوں گے کہ یہاں کے وزرا اکثر قلمدان وزارت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اکثر جلد مستعفی ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات بھلا کس انسان کو دیوانہ نہ کر دیں گے۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک صدی سے مسئلہ تجارت اور صنعت قومی اور ملکی ہستی کے لئے اس قدر ضروری ہو گیا تھا تو حکومت عثمانی کیوں اپنی بقا کی طرف سے غافل خواب خرگوش میں سوتی رہی؟ اس کا جواب بلکہ تمام معمے کا جواب کہ ایشیا باوجود جغرافیائی اور تعدادی حیثیت سے یورپ سے زیادہ ہونے کے کیوں پس افتادہ ہے، یہ ہے کہ استبداد یعنی مطلق العنان حکومت فروغ تجارت اور فروغ آزادی دونوں کے متضاد اور متخالف ہے۔ عبدالعزیز اور عبدالحمید تو نہایت ظالم اور جابر اور وطن اور اسلام دشمن بادشاہ تھے لیکن بفرض محال اگر ان کی جگہ کوئی منصف اور وطن پرست

حکمران بھی ہوتے تو بھی یہ حالت پیش آنی ایک حد تک لازمی تھی۔ ایک انسان کی دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ ہر شے کو نہیں دیکھ سکتا نہ جان سکتا ہے جب فروغِ تجارت نے دنیا کو ریلوں اور جہازوں کے راستوں سے وابستہ کر دیا اور ہر ملک کے لوگ دوسرے ملکوں میں آنے جانے لگے تو جیسا کہ ظاہر ہے ہر سلطنت کا کام نہایت مشکل ہوگیا۔ گویا سلطنت قومی حیثیت سے بین الاقوامی (International) حیثیت اختیار کرگئی۔ اور اسکی حفاظت کے لئے یہ امر لازمی ہوگیا کہ بجائے دو آنکھوں کے ہزار آنکھیں محافظ سلطنت ہوں۔ یورپ نے ضروریات کے مطابق اپنے قوانین کو جو شروع ہی سے ''تقسیم اختیارات سلطنت'' کے اصول پر مبنی تھے زمانہ اور وقت کے لحاظ سے اور زیادہ آزاد بنالیا۔ ایشیا میں بھی جاپان نے زمانے کی رفتار کو پالیا اور مشروطہ حکومت کے حصول کی کوشش کرتے رہے۔ نہ عبدالعزیز نہ مراد خامس کے زمانے میں کوئی مطلب براری ہوئی، جب سلطان عبدالحمید تخت پر بیٹھے تو مدحت پاشانے اپنا مطالبہ قوم کی جانب سے پیش کیا۔ مگر سلطان عبدالحمید شہنشاہ جاپان کا ضد میں جواب تھے۔ مدحت پاشا اور شیخ الاسلام کو جلاوطن کیا گیا اور بالآخر مدحت پاشا کو خفیہ طور پر پھانسی دلوادی گئی۔ مگر آزادی کا درخت تو ہمیشہ خونِ شہیداں ہی میں پرورش حاصل کرتا ہے۔ سلطان حمید کی

تلوار مدحت پاشا کے پیروان کار کو کیا ڈرا سکتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان عبدالحمید اور اس کے موئدین ایک طرف اور فدا کار وطن دوست دوسری طرف دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ الا ماشاء اللہ تمام اہل الرائے اور صاحب دماغ لوگ دوسرے گروہ میں تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس کسی نے وقت اور زمانے کے لحاظ سے کوئی نیک آزادانہ صلاح دی، فوراً ''حریت پسندوں'' میں سے سمجھا گیا اور اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ پولیس کے سپاہی مسلح اچانک شب کو کسی کے دروازے پر آجاتے تھے اور منہ پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کر کے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ وہ خود اور سب عزیز دوست جانتے تھے کہ جہاں جا رہا ہے وہاں سے کبھی واپس نہ آئے گا۔ بحر مرمرہ میں اس قدر شہداء کی لاشیں مچھلیوں کا لقمہ ہوئی ہیں کہ ترک مرمرہ کی مچھلی نہیں کھاتے۔ جب ملک کی یہ حالت تھی مغربی (یورپی) اقتدار تجارت کے ذریعے بڑھ رہا تھا۔ اس سے بہتر زمانہ یورپ والوں کو میسر نہ آسکتا تھا۔ جو صلاح نیک دینے والے تھے وہ تہ دریا جا سوئے۔ یورپی سفیروں، ایجنٹوں، مشنریوں، اہل دول تاجروں اور یورپی جماعتوں کے فرستادہ وکلاء نے خوشامد طلب اور خوشامد پسند اور عبدالحمید کے خوشامدی پاشاؤں اور وزراء کے ساتھ مل کر ہر جگہ رسوخ پیدا کر لیا اور اپنا اثر جمالیا۔

سفراء نئے نئے قرضوں کی ضرورت پیدا کرتے اور سمجھاتے رہے اور قرضہ دلواتے رہے۔ کسی قرض میں محاصلات رسمیہ (Customs) دوسری حکومت کے ہاتھ میں چلے گئے۔ کسی میں محاصلات ماہی گیری جس میں صدف اور موتی شامل ہیں ان کو مل گئے اور قرضہ دیا۔ ڈاک خانوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تمام قوموں کے ڈاک خانے اس سلطنت میں قائم ہیں۔ قانونی حیثیت سے تمام قوموں کو حکومت کے اثر سے آزاد کرالیا اور ہزاروں قیود عائد ہوگئے۔ گویا آج تمام سلطنت یورپ کے ہاتھ رہن ہے اور قرضہ سودی ہے۔ اہل دول تاجر آئے اپنی کوشش، اپنے سفراء کی سفارش اور بادشاہ کو تحائف اور وزراء کو رشوتیں دے کر ہر چیز میں اپنا فروغ جمالیا۔ بہت سی Monopolies لے لیں۔ مثلاً تمبا کو بیچنے کا سوائے Regie کی کمپنی کے کسی کو اختیار نہیں۔ جہاں اہل ملک کو اپنی تعلیم میں حصہ لینے کی نہ رغبت ولائی گئی اور نہ ان کی امداد کی گئی وہاں مشنریوں کو پوری آزادی دی گئی۔ غرض رفتہ رفتہ تمام دولت ملک کی سمٹ کر غیر اقوام کے ہاتھ میں آگئی اور ان کے ہاتھ میں ہے۔

یہ تو بڑی تجارت کا حال ہے جو اصلی اور حقیقی تجارت ہے، رہی چھوٹی تجارت یعنی مال دوسرے کارخانے سے خریدنا اور منفعت قلیل یا کثیر

پر بیچناوہ یا تو یونانیوں کے ہاتھ میں ہے یا آرمینیوں یا یہودیوں کے پاس ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھ میں دولت عثمانیہ سے بدر جہاز یادہ تجارت ہے۔ بیشتر حصہ ہائے شہر میں نیز بیرونجات قصبوں اور جزائر میں میلوں تک مسلمان طعام فروش تک کی دوکان نہیں ملتی۔

پیرا یا بیوغلی جوشہر کا نیا حصہ ہے سوائے یورپی لوگوں کی دوکانوں اور بنکوں کے کچھ نہیں۔ میرے ایک دوست نے جو مجھ سے قبل یہاں ایک برس ہوا آئے تھے مجھے لکھا تھا کہ ''میں نے قسطنطنیہ کو دیکھا۔ میں سمجھا تھا کہ اگر پیرس یا برلن نہیں تو کم از کم یورپ کے دوسرے درجے کے شہروں ایسا خوش تعمیر اور صاف ستھرا ہوگا۔ سخت مایوس ہوا۔ پیرا (بیوغلی) البتہ غنیمت ہے'' میں خود جب پیرا (بیوغلی) کو دیکھتا ہوں تو سخت مایوس ہوتا ہوں۔ یہ حصہ یورپ کی ملکیت، یورپ کی قوت کا مرکز اور یورپ کے اثر کا نشان اور سلطنت کی آئندہ مشکلات کا سرچشمہ اور سلطنت کی گذشتہ خرابیوں کا معدن اور سلطنت کے موجودہ مصائب کا منبع ہے۔ دوسرے حصے جو غریبانہ طور پر تعمیر شدہ ہیں جن میں صفائی نہیں اور جن کی حالت سے میرے دوست کو عار آیا تھا غنیمت ہیں۔ وہ ہمارے اپنے ہیں۔

غرض یہ مختصر کیفیت ہے۔ اس کا علاج کیا ہے۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد　　اگر خارے بود گلدستہ گردد

بیداری کے آثار روز بروز نمایاں ہیں، جب کوشش کریں گے تو مشکلات کے حل ہونے کے راستے خود ہی نکل آویں گے۔ پس اس بیان کے مطالعے سے متاسف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام کے آئندہ عروج کے لئے بشارت الٰہی موجود ہے اور مسلمانوں کی کوششیں جو روز افزوں ہیں انشاء اللہ ثمر یاب ہوں گی۔ البتہ ہر شخص کو اپنے فرض کے ادا کرنے میں تیار اور مستعد ہونا چاہئے۔

چار سال سے ترکوں نے توجہ شروع کی ہے۔ دکانیں نکال رہے ہیں، ایک دو بنکوں میں بھی شرکت کی ہے۔ یوں ہی رفتہ رفتہ ترقی ہوتی جائے گی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہئے کہ ان سے تجارتی ارتباط قائم کریں اور یہاں کے مسلمانوں کی تجارت کے لئے ہندوستان میں سہولتیں پیدا کریں۔

آئندہ انشاء اللہ ترکوں کی تمدنی حالت پر جو نہایت دل خوش کن ہے کچھ لکھوں گا۔ یہ تحریر محض جناب کی اطلاع کے لئے ہے۔ اخبارات میں اگر کچھ لکھوں گا تو علیٰحدہ کم وبیشی کرنے کے بعد لکھوں گا۔

قسطنطنیہ کی آب وہوا بہت اچھی ہے۔ یہاں یورپ کی طرح ہر روز

بارش نہیں ہوتی رہتی۔ دوسرے بغاز اور بحر کے قریب ہونے سے صحت کے لحاظ سے یہ جگہ بہت عمدہ ہے۔

بحمد اللہ رمضان بخیر وخوبی ختم ہوا؛ تمام روزے پورے ہوئے۔ کوئٹہ کے روزہ داروں کا حال معلوم ہوا، اللہ قبول فرماوے۔

اب میں انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں یہاں سے مراجعت کروں گا۔ ارادہ ہے کہ یونان اور اطالیہ (روما) کے راستے سے جاوں گا مگر کچھ طے نہیں کیا ہے۔ اگلے عریضے میں مفصل اطلاع دوں گا۔

چنو میاں کے حالات دریافت ہوئے، تصویریں بھی پہنچیں۔ بہت خوش ہوا۔ میڈل حقیقت میں نہایت ہی عمدہ اور خوش وضع ہے۔

حضور امی جان مکرمہ معظمہ مدظلہا کی خدمت میں دست بستہ آداب عرض ہے؛ ہمشیرہ روشن آرا اور عزیز شبیر الدین کی جانب سے ہمیشہ تردد ہے۔ خداوند تعالیٰ عزیز مذکور کو بجنوری حکیم کے علاج سے شفا بخشے' ہمیشہ دعا ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔

ہمیشہ سلامتی مزاج وہاج کا خواہاں اور جویان عافیت ہوں۔ زیادہ حد ادب۔

عبدالرحمٰن

(۱۱)

دارلسعادت،

۲۵ ستمبر ۱۲ء

عالی حضور قبلہ وکعبہ ام مکرم معظم محترم مدظلہ العالی

آداب۔ پس از تسلیمات عجز دست بستہ گزارش ہے۔ والا نامۂ گرامی شرف صدور فرما ہوا اور جملہ احوال مندرجہ سے آگاہی ہوئی۔ سلامتی مزاج وہاج وخیریت جملہ خورد وکلاں دریافت ہوکر خوشی ہوئی۔ روشن آرا بانو کی بدرالدین کے ہمراہ سیوہارہ روانگی کا حال معلوم ہوا۔ ہنڈی اور قرآن شریف اور چنومیاں کی تصویروں کی رسید گزشتہ خط میں عرض کر چکا ہوں۔ بشیرالدین کے متعلق قبلہ ماموں جان کے والا ناموں سے کیفیت معلوم ہوکر ہنوز تعلق خاطر ہے۔ میں یہاں بخیریت ہوں۔ بخوبی تمام سیر کر چکا ہوں۔ انشاء اللہ ہفتہ بھر کے اندر اندر یہاں سے مراجعت کروں گا۔ یونان اور اطالیہ یا کسی دوسری راہ سے جانے کے متعلق آئندہ ہفتہ مطلع کروں گا۔ امید ہے کہ بحصول عریضہ ہذا آپ بہمہ وجوہ بسلامتی ہوں گے اور جملہ خورد وکلاں مع الخیر ہوں گے۔

انشاء اللہ آئندہ ہفتہ مفصل عریضہ ارسال خدمت کروں گا۔ بوجہ

باہر جانے کے آج نہیں لکھ سکا۔ اور امید ہے کہ بہر طور عافیت ہوگی۔

حضور امی جان مکرمہ مدظلہا کی خدمت میں دست بستہ آداب عرض ہے۔ اور سب کو ماوجب پہنچے

زیادہ حد ادب۔

عبدالرحمٰن

باہر نہیں گیا، لکھتا ہوں۔

گذشتہ دو عریضہ جات میں میں نے ترکوں کی سیاسیات اور اقتصادیات کا کسی قدر دل کو افسردہ کرنے والا نقشہ کھینچا تھا۔

اس خط میں ترکوں کی تمدنی کیفیت مختصراً کچھ عرض کرتا ہوں۔

ترکوں کے موجودہ زوال کا باعث ان کے دو بادشاہ عبدالعزیز اور عبدالحمید ہیں جن کے زمانے میں ظلم وستم، اپنوں سے جفا اور غیروں سے دوستی کے باعث نوبت یہاں تک پہنچی ہے مگر باوجود اس نیم صدی کے ہر طور کے مصائب کے ترکوں کا اس درجہ بھی قائم رہنا ایک عجیب تاریخی معمہ ہے۔ ریاست ہائے بلقان میں اور روس و آسٹریا کے نرغے میں بتیس دانتوں میں زبان کی طرح سلامت ہونا، جرمنی اور انگلستان کی جنگ کی سیاسیات کے جال میں پھنس کر ہنوز طاقت پرواز رکھنا، آئے روز حملوں کے تصادم سہنا،

قرض کا بارگراں اٹھانا مگر شکست تسلیم نہ کرنا، آخر اس کا راز کیا ہے؟ خود ملک کی آبادی ایسی ہے کہ گھر کے عیسائی دشمن باہر والوں سے زیادہ خوفناک ہیں۔ عرب اور البانیہ کے مسلمان جہالت کے باعث اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی چن رہے ہیں۔ اس کا راز ترکوں کی شخصی کیفیت ہے۔

عبدالعزیز اور عبدالحمید اور ان کے خوشامد طلب اور خوشامد پسند وزراء نے جو ظلم وستم اور بدنظمی اور طوائف الملوکی کا نقشہ پیش کیا وہ ان کی ذاتی بدی سے متعلق ہے۔ دولت عثمانیہ میں یہ جابر بادشاہ، ان کے ظالم حاکم اور ان کے پروردہ ان ہی کی مثال بہت سے محکمہ جات کے افسر تھے۔ مگر قوم میں کسی قسم کا اخلاقی یا مذہبی یا تمدنی نقص پیدا نہ ہوا تھا۔ قوم سے مراد یہاں ترک ہیں۔ جس طرح آگ میں پڑ کر سونا اور آب وتاب حاصل کرتا ہے اس ظلم وستم سے ان کی خوبیاں اور نمایاں ہوئیں۔

پس گو خارجی اثرات نے حکومتی جماعت کے جسم کو زہر آلود کر دیا تھا، قوم کا بدن اس کے اثر سے بالکل پاک تھا۔ یہ قدرت کا فتویٰ ہے کہ کوئی قوم تباہ نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی مجموعی حیثیت خراب نہ ہو جاوے۔ چوں کہ ترکوں نے اپنی ذاتی خوبیوں کو برقرار رکھا یہ نصف صدی ان پر اس طرح گزر گئی ہے جیسے بادِ سموم قافلے کے سر پر سے گزر جاتی ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ ترک اپنی عیسائی رعایا کے مقابلے میں تعداد میں کم ہیں۔ دولت اور تجارت عیسائی رعایا کے ہاتھ میں ہے مگران عیسائیوں میں خواہ وہ بلغاری ہوں یا ارمنی یا یونانی جو بدترین ہیں اور ترکوں میں ایک فرق ہے جو ایک نگاہ میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

ترکوں میں شرافت، جسارت، دیانت، تقویٰ، غرض انسانیت کا ہر ایک جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان عیسائیوں کی رذالت، بزدلی، فریب دہی، فسق و فجور کی زندگی، بہائم سے کسی درجہ کم نہیں۔ ترکوں کی خوبیوں کو ان کی اپنی عیسائی رعایا سے ہی یہ نسبت نہیں بلکہ تمام اہل یورپ سے بھی یہی نسبت ہے۔ ہندوستان، ایران وغیرہ کے مسلمانوں میں جو اسلامی روح مفقود ہے وہ عثمانیوں کے سینے میں موجود ہے۔ عربوں میں خواہ سرزمین مقدس کے ہوں یا سواحل افریقہ کے سوائے جسارت کے تمام اسلامی خوبیاں محو ہو چکی ہیں۔ ترک اسلام کے موجودہ لق و دق صحرا میں ایک سرسبز نخلستان ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ترکوں کی ان قلبی خوبیوں کو کس طور قلمبند کروں۔

سب سے بڑی خوبی جو ترکوں میں ہے وہ اخوت اسلامی کا وجود

ہے۔قسطنطنیہ ہی دنیا میں، میں نے ایک ایسا مقام دیکھا ہے جہاں شاہ وگدا کا ایک رتبہ ہے۔

عالی حضور خلیفتہ المسلمین جو مسند رسول اللہ کے جانشین ہیں۔ سادگی اور اخلاق کی مجسم تصویر ہیں۔آپ کی نسبت مشہور ہے کہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم کو آفندم (میرے آقا) کے بغیر خطاب نہیں فرماتے۔

شاہزادوں کی یہ کیفیت ہے کہ ولی عہد شاہزادہ یوسف عزالدین آفندی عام قہوہ خانوں میں آکر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک پیالہ قہوہ پی کر یا اخبار ملاحظہ فرما کر تشریف لے جاتے ہیں۔شہزادہ ضیاء الدین آفندی سلطان المعظم کے فرزند ایک دن ایک مقام پر جہاں عثمانی بیڑے کی طیاری کے لئے شب میں سرود ہوتا ہے میرے قریب ہی تشریف فرما تھے۔عام قہوہ خانوں سے میری مراد وہ پیرا کے قہوہ خانے نہیں ہیں جہاں پر یورپی لاکھوں روپیہ کے ٹھاٹھ نظر آتے ہیں بلکہ اسلامبول خاص کے قہوہ خانے جہاں حمال اور سپاہی اور افسر اور شرفا سب آتے جاتے اور بیٹھتے ہیں۔کوئی ترک بغیر کسی کام کے ان مغربی قہوہ خانوں میں جو فردوس نظر ہیں اور جن کی مثال یورپی قہوہ خانوں پر ہمارے مشرقی جان و دل فدا کرتے ہیں نہیں جاتا کیونکہ ان کو سادگی اور اخوت کا خیال مانع ہے۔

جہاں دیکھئے غریب اور امیر، کس و ناکس آزادی سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یہ عین اسلام ہے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں یہ خوبی انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہم میں سے جا رہی ہے۔

ترک صدیوں سے مغربیوں کے ہمسایہ ہیں اور مغربی قوموں میں جو عیوب ہیں دنیا کی بدترین اقوام میں نہیں ہیں جن سے وجدانِ صحیح ہمیشہ نفرت کرتا ہے۔

مشرقی ممالک کے بہت سے لوگ طالب علمانہ اور اَور حیثیتوں سے یورپ میں آتے ہیں اور ہمیشہ مغربی بدتہذیبی کے شیدا ہو جاتے ہیں مگر ترک آج تک جس طرح آب کثیف میں پائے نگاہ تر نہیں ہوتا، بے لوث ہیں۔ یہ کہہ دینا بہت آسان بات ہے مگر غور کیا جائے تو اس سے بڑھ کر قومی عصبیت اور اسلامی اثر کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔

ترک مغربی طرز معاشرت رکھتے ہیں۔ مغربی لباس سوائے فیض کے پہنتے ہیں۔ عورتیں مغربی لباس پہنتی ہیں۔ مغربی طرز طعام رکھتے ہیں مگر اس مغربی جسم میں سراپا اسلامی روح ہے۔

یہ سب پابند نماز روزہ ہیں۔ اسلامبول میں بے شمار جامع ہیں جس وقت جس مسجد میں چلے جائیے اگر نماز کا وقت ہے تو مسجد بھری ہوئی ہے اگر

نماز کا وقت نہیں تو بیسوں اور بڑی مسجدوں میں سینکڑوں آدمی بیٹھے ہوئے تلاوت کررہے ہیں یا قرآن مجید سن رہے ہیں۔فوجی افسر چھوٹے سے لے کر جنرل تک وردیوں میں تلوار کھولے بوٹ اتارے مشغول نماز یا عبادت ہیں۔ ماہ رمضان میں ہر کس دنا کس دن بھر سوائے تسبیح پڑھنے کے کچھ نہیں کرتا۔

شراب پینے کی عادت ترکوں میں تمام دنیا کے مسلمانوں سے کم ہے۔ احکام شرعیہ کے سخت پابند ہیں۔حکومت کی طرف سے بھی اخلاقی پولیس مقرر ہے۔ ماہ صیام میں سب روزہ رکھتے ہیں۔اطوار میں جن میں اہل یورپ بہائم سے زیادہ ہیں ترک پاک ترین زندگی بسر کرتے ہیں۔ان کی عورتوں میں پردہ جائز آمد و رفت اور کاروبار کی آزادی سے ہے اور تمام مسلمان خواتین کی طرح یہ سب عصمت وعفت کی دیویاں ہیں۔

ان میں اسلامی جسارت اس قدر ہے کہ دنیا میں ان سے زیادہ جسور کوئی قوم نہیں۔ایک ترک دس دشمنوں پر بھاری ہے۔ بچے بچے کو غزا اور شہادت کا شوق ہے۔ سلطان عبدالحمید کے زمانے میں سپاہیوں کی یہ حالت ہوئی تھی کہ برسوں تنخواہ کا نام نہ تھا۔ وردیوں کی دھجیاں بھی باقی نہ تھیں اور پاؤں میں جوتے تک نہ تھے مگر برابر ''پادشاہم چوق لیشا'' کے نعرے

لگاتے تھے۔ اگر ان سے دریافت کرو کہ باوجود ان تکالیف کے تم کیوں ملک اور ملت کا دم بھرتے ہو تو کہتے تھے کہ ہم نے بہت سے اچھے بادشاہ پائے، اب ایک برا بادشاہ ہے یا اس کے وزیر برے ہیں، اگر ہم صبر کریں گے تو خدا ایک دن بہتر بادشاہ بھیج دے گا۔ جہاں یمن یا کہیں اور بغاوت ہوئی یہی سپاہی گئے اور لڑے۔ اگر یورپ کی بہترین فوج کو دو دن شراب نہ دی جائے تو افسروں کو قدر عافیت معلوم ہو جاوے۔ خود انگاری کا جوہر ترکوں کے رگ و ریشے میں ہے۔

یہ لوگ اس قدر اسلام دوست ہیں کہ جو کچھ ہمدردی اور برادرانہ معاونت ہم ان کی کرتے ہیں وہ کیا، اگر ہم ان کے نام پر اپنی جانیں تک فدا کر دیں تو کم ہے۔ کرنل سامی بے، سلطان المعظم کے خاص گارڈ کے افسر ہیں، ایک دن سلاملق میں ان سے ملاقات ہوئی۔ قصر یلدیز کے آستانے میں رہتے ہیں، اپنے ہمراہ لے گئے۔ اثنائے گفتگو میں، میں نے ذکر کیا کہ علی گڑھ کالج کے طالب علم جب سے جنگ طرابلس ہوئی ہے، پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتے اور جو دام بچتے ہیں طرابلس کے لئے بھیجتے ہیں۔ بے اختیار رونے لگے۔

ایک میرے دوست لیفٹیننٹ محمود بابر آفندی ہیں۔ ہمیشہ کہا کرتے

ہیں کہ دیکھو تم ہمارے لئے اس قدر کچھ کرتے ہو اور ہم تمھارے یا کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر یہ صحیح نہیں کیوں کہ حیات اسلام ترکوں کی ذات سے وابستہ ہے۔ خدا وہ دن نہ لائے، جس دن یہ نہ ہوں گے مسلمانوں کا دور ختم ہو چکا ہوگا۔

کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے۔

وہ وزراء اور امراء جن کے آستانے پر بڑے سے بڑے آدمی رسائی نہیں پاتے صرف اتنا کہنے پر کہ آپ "مسلمان مسافر مہمان" ہیں استقبال کے لئے نکل آتے ہیں۔ جو لوگ کہ دول کے سفیروں کے لئے اپنی نشست سے جنبش نہیں کرتے تو اضع کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ آپ مسلمان ہیں؛ اور خاطر داری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ جن مقامات کو دیکھنے کے لئے ایک ایک ماہ قبل اطلاع دینے کی ضرورت ہے وہ آپ کے لئے ہر وقت کشادہ ہیں۔ سلاملق میں میں ہر ہفتہ جاتا ہوں۔ تمام انگریزوں، جرمن، روسی لوگوں کو پاسپورٹ دکھلانا پڑتا ہے۔ مجھے صرف اس وجہ سے کہ میں اجنبی مسلمان ہوں سب سے آگے کھڑا کر دیتے ہیں، میرے لئے کوئی روک ٹوک نہیں۔

مہماں نوازی کی یہ کیفیت ہے کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں کسی جگہ

کھانا کھانے گیا ہوں اور کسی شخص سے جو میز پر سامنے یا قریب بیٹھا ہو گفتگو ہوئی، یا تر کی نہ جاننے کی وجہ سے نہ ہو سکی صرف دو ایک اشاروں میں باتیں ہوئیں، اب وہ مُصر ہے کہ میں اس کا مہمان ہوں۔ اگر انکار کروں تو ترک اس سے زیادہ کسی چیز کا برا نہیں مانتے۔ اگر میں کسی کو مہمان کرتا ہوں تو کہتے ہیں کہ تم ہمارے ملک میں ہو یہ ممکن نہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ جب چلتے وقت کھانے کے دام ادا کرنے کے لئے ملازم کو بلایا تو اس نے کہا کہ ''جو صاحب آپ سے باتیں کر رہے تھے وہ ادا کر چکے ہیں''۔ جہاں کہیں کسی شخص سے ملاقات کیجئے، گھر میں ہو یا باہر، فوراً چاء قہوہ راحت لقوم وغیرہ کی تواضع کریگا۔ سرکاری دفاتر میں جائیے، چونکہ آپ اجنبی مہمان ہیں وہاں بھی یہی کیفیت ہے۔

اسلام کی ترقی اور اسلام کے اتحاد کا خیال ہر شخص کو دامنگیر ہے اور ہر طرح کی کوششیں اس کے لئے کی جارہی ہیں۔

اس وقت سب سے بڑی ضرورت ''دوتما'' یعنی بیڑے کی ہے۔ ہر طرح اس کے لئے چندہ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شرفا ہر جگہ بندسر بہ مہر بکس لئے ہوئے مانگتے پھرتے ہیں۔ مسجدوں میں پاشازادیاں مانگتی ہیں۔ ناٹکوں میں بچے مانگتے ہیں؛ ہر روز شب میں رمضان بھر ایک جگہ امداد

کے لئے سرود ہوتا رہا۔ ہر کس و ناکس ہمیشہ دیتا ہے۔ یہ بات ان کے دل سے لگی ہے اور ضرور اپنے ارادہ میں عمدہ طرح کامیاب ہوں گے۔ ایک عجائب خانہ اسی امداد کے لئے بنایا ہے جہاں ایک روپے کا ٹکٹ لاٹری کا ملتا ہے۔ لاٹری میں کوئی ایک آنے دو آنے کی قلیل القیمت چیز مل جاتی ہے۔ تنخواہ پاتے ہی تمام سپاہی اور ملاح یہاں آتے ہیں اور ایک ایک نہیں بلکہ زیادہ ٹکٹ خریدتے ہیں۔ ان کی حیثیت کے لحاظ سے اس سے زیادہ قوم پرستی کیا ہوسکتی ہے؟

جس قوم کی مجموعی حیثیت یہ ہو، جن میں یہ اخلاقی، مذہبی اور تمدنی محاسن موجود ہوں وہ قوم بھلا کسی کے مٹائے مٹ سکتی ہے؟ جب مسلمانوں نے اندلس کو فتح کیا تو بادشاہ نے اپنے ندماء سے دریافت کیا کہ ہمارے پاس لشکر کثیر ہے اور ہر طرح کے سامان مدافعت موجود ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ مسیحی لشکر مغلوب ہوتا جاتا ہے؟ کسی کو کوئی جواب بن نہ آیا۔ اس وقت ایک پیر مرد راہب نے کہا جہاں پناہ مسلمانوں کے اخلاق ہم سے اچھے ہیں۔

ترک نہ صرف اپنی گذشتہ کھوئی ہوئی عظمت کو پھر حاصل کریں گے بلکہ انشاء اللہ دوبارہ یورپ کو فتح کریں گے اور اہل یورپ ان کے حملے کی

تاب نہ لاسکیں گے کیوں کہ ترکوں کے اخلاق ان سے اچھے ہیں۔

عبدالرحمٰن

مذکورۂ بالا صرف حضور کی اطلاع کے لئے تحریر ہے اگر وقت ملے گا تو کسی رسالے وغیرہ میں یہاں کے حالات ردوبدل کے بعد شائع کروں گا۔

(۱۲)

دارلسعادت، اسلامبول

۱۴ اکتوبر ۱۲ء

عالی حضور قبلہ و کعبہ ام مکرم معظم مدظلہ العالی

دست بستہ آداب گذارش ہے۔ صحیفہ سامی ورود فرما ہوا، اور مطالعہ اس کا باعث غایت خوشی اور عین الطمینان کا ہوا۔ جملہ خورد و کلاں کی خیریت کا دریافت ہونا موجب طمانیت ہوا، امید ہے کہ بحصول اس عریضہ کے سب بخیر و خوبی، خوش و خرم ہوں گے۔ بحمد اللہ میں بھی بصحت اور بخیریت ہوں۔

یہاں سے دو روز میں جمعہ کے دن آسٹرین لائڈ کمپنی (Austrian Lloyd Co.) کے جہاز کے ذریعے مراجعت کروں گا۔ ٹکٹ خرید لیا ہے۔ اول یونان اشیتہ (Athens) میں دو روز قیام کا قصد ہے۔ آثار الصنا دید وکھ کر اسی کمپنی کے دوسرے جہاز میں دو روز بعد سوار ہو کر ساحل برنڈسی

(Brindisi) پر اتروں گا، یہاں سے براہ ریل شہر نیپلز (Naples) کا ارادہ ہے۔ وہاں سے روما (Rome) جاؤں گا۔ روما سے وینس (Venice) اور وینس سے فلارنس (Florence)۔ اس کے بعد اگر ہوسکا تو میلان (Milan) اور زیورچ (Zurich) کو بھی جو راستے میں ہیں دیکھوں گا۔ اس طور اطالیہ اور اسوئچ (Switzerland) سے گذرتا ہوا فرائی برگ جاؤں گا۔ وہاں یونیورسٹی کے نئے سمسٹر (یعنی ٹرم) کے کاغذات کی خانہ پری کر کے اپنا نام درج کر کے حاضری مندرج ہوجانے پر لندن کے کھانوں کے لئے جاؤں گا۔ انشاء اللہ راستے میں جہاں ڈاک کا وقت آوے گا خطوط بر وقت روانہ کرتا رہوں گا۔

آپ کے دو تین ہفتوں کے خطوط فرائی برگ پہنچنے پر ملیں گے۔ راستے کا پروگرام چوں کہ قطعی معین نہیں اس وجہ سے راہ میں کسی شہر میں Post Restaurant کی معرفت نہیں منگاؤں گا۔

اور کوئی امر لائق گوش گذارش نہیں، سب خیریت ہے۔

یہاں کے نئے حالات یہ ہیں کہ دو ہفتوں سے گلی کوچوں میں ''لیشا سون حرب قہر السوں دشمنلر زندہ باد'' جنگ قہر بر دشمناں کی صدائیں بلند ہیں۔ آج نہیں تو کل بلقان سے جنگ شروع ہوجائے گی۔ قرہ طاغ

(Montenegro) سے جنگ ہو رہی ہے۔

جو شخص یہ دیکھنا چاہے کہ ترک کس وجہ سے زندہ قوم ہیں اور عثمانیوں کی ملّت میں حیات اور زندگانی اور روح کیا چیز ہے اس کو آج اسلامبول میں آکر دیکھنا چاہئے۔

ترک آج اپنی تواریخ میں سب سے بڑے امتحان کے لئے جا رہے ہیں کیوں کہ اس جنگ کی پشت پر ایک اور جنگ ہے، یعنی جنگ روم و روس، جس دن اس طرف (یعنی بلقان) سے فارغ ہو کر یہ فاتح ہو کر مراجعت کریں گے اسی دن روس کی طرف سے اعلان جنگ ہوگا۔

تمام یورپ بلا استثنا ترکوں کا دشمن ہے۔

لیکن اگر ان کو اس امتحان میں جاتے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام حقیقی جس سے ہم ناواقف ہو چکے ہیں کیا چیز ہے۔

کس قدر خورد و کلاں طفل و بزرگ مرد اور عورت سب کو خوشی ہے۔

عید کے دن اس کی دسویں کسر رونق نہ تھی جتنی اسلامبول میں آج کل ہے۔ ایک روز تمام شہر کی مجالس اور انجمنوں نے جن کی تعداد صدہا ہے جنگ کی خبر سن کر خوشی کے جلوس نکالے تھے، تمام شہر میدان سلطان احمد میں امنڈ آیا تھا اور لوگوں کے جوش کی کوئی حد نہ تھی۔ سہ پہر کو تمام جلوس حضور خلیفہ اعظم

سلطان الاعظم کی خدمت میں گئے۔ آپ کو جب خبر ہوئی تو ارشاد ہوا کہ محل کے دروازے تمام کھول دو اور سب کو اندر آنے دو اور خود تھوڑی دیر میں محل کے دریچہ میں تشریف لائے۔ اس وقت جو ''پادشاہم چوق لیشا'' (بادشاہ سلامت ہیں) کا نعرہ بلند ہوا ہے اسکی کیفیت بیان اور تحریر سے باہر ہے، لوگ خوشی اور مسرت سے دیوانے ہوگئے۔ جب کچھ ہوش آیا تو سب نے ''آزادی'' کا نغمہ گایا۔ حضور نے سلام کیا۔ دو ہفتوں سے صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک فوجیں بلقان کی طرف جارہی ہیں۔ اس وقت تا دم تحریر دس لاکھ فوج میدان میں اتر چکی ہے۔ وہ البانی جو ہمیشہ حکومت کے راستے میں مشکلات ڈالنے کے لئے بدنام ہیں سب سے آگے گئے ہیں۔

البانیوں کو بلقان کی ریاستوں نے پیغام دیا تھا کہ ہم یہ سب تمھاری آزادی اور تمھارے فائدے کیلئے کر رہے ہیں۔ البانیوں نے اپنے لیڈر درویش ہیما کے ذریعے جواب دیا کہ ہم اس امر کے متعلق صوفیہ اور بلغراد اور بخارسٹ (Bucharest) اور اثینیہ (Athens) پہنچ جانے پر بحث کریں گے۔

سرعسکرت (محکمہ جنگ) میں ہر وقت ہزار ہا ہزار سپاہی مسلح اور تیار ہونے کے لئے کھڑے ہیں۔ جب تیار ہو جاتے ہیں تو پہلا بگل بجتا ہے جس میں ان کو دعوت جنگ اور خلیفہ اور سلطان کی مملکت کے دشمنوں کی

مدافعت کی عزت کی خوش خبری دی جاتی ہے، سب سپاہی ''پادشاھم چوق لیشا'' کے نعرے لگاتے ہیں۔ دوسرا بگل بجتا ہے، پھر نعرہ سلامتی بلند ہوتا ہے، تیسرا بگل بجتا ہے اور سب اپنے خلیفہ اور بادشاہ کو دعا دیتے ہوئے سر بکف شاد ماں اور مسرور روانہ ہو جاتے ہیں۔

گلیوں کوچوں شارعوں پر لوگ صبح سے شام تک اور رات میں بھی ان غازیوں اور شہادت کے مشتاقوں کو مرحبا کہنے کے لئے کھڑے رہتے ہیں اور تمام قلوب سے ان کی نصرت کی دعا نکلتی ہے۔

میں نے چند ملکوں کی فوج کو دیکھا ہے۔ بلقان کی فوجوں میں سے بھی بلغاری اور سربی فوج کو دیکھ چکا ہوں۔ ان کا تو کوئی تذکرہ ہی نہیں۔ انگریزی فوج بھی ناقص افواج میں شمار ہے۔ انگریزی طاقت محض بحری بیڑے پر مبنی ہے۔ جرمن فوج اس وقت دنیا کی بہترین فوج ہے۔

جرمن فوج کے مقابلے میں ترکی فوج اگرچہ بلحاظ خوبی اسلحات و سامان اور لباس اور اشیاء ضروری کے بوجہ غربت کم ہیں لیکن جو سپاہی اور اہل جروت عثمانی عسکر کے افراد ہیں ان کو جرمن نہیں پا سکتے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ جرمن فوج بہترین نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ جہاں تک دولت اور ذاتی قابلیت کے احاطہ میں تھا جرمنوں نے فوجی عظمت کے فوق السماء کو

پالیا ہے لیکن وہ مجاہدے کی روح جو ترکوں میں خاص ہے، وہ جنگ پرستی اور بہادری جوان کے خون میں ہے جرمنوں میں نہیں ہے۔ عثمانی فوج کا ہر سپاہی طبعاً شیر ہے۔ جرمنوں میں فن جنگ اکتسابی ہے ترکوں کی گھٹی میں جنگ پڑی ہوئی ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں محاربہ بلقان کے بعد جنگ روم و روس ہوگی اس لئے اس جنگ میں نہایت اقتصاد اور جزورسی سے لڑیں گے اور ہر طرح کی عجلت سے باز رہیں گے تا کہ جہاں تک ممکن ہو فوج دوسرے محاربہ کے لئے بھی چاق اور تیار حالت میں رہے اور خستہ نہ ہو جائے۔

سربیا کے خلاف محمود شوکت پاشا نے کمان لی ہے۔ یہ اس وقت یورپ کے مشاہیر میں سے ہیں اور فن جنگ کے مشہور شاطر ہیں۔ انکا قول ہے کہ جنگ کا قاعدہ یہ ہونا چاہئے کہ بازی شطرنج کی طرح، جس وقت فاتح کمانداں نے اپنے مورچوں اور لشکر کو اس طرح سے قائم کر دیا کہ مفتوح زچ ہو گیا اور کوئی راہ نہ رہی، جنگ کو ہر دو فریق کو بلا لڑے ختم مان لینا چاہئے۔

جب انھوں نے تقسیم (Taxim) کی لڑائی فتح کی ہے یعنی سلطان عبدالحمید کو شکست دی ہے اور تخت سے اتارا ہے تو اس خوبی سے عمل کیا کہ تمام اہل شہر بطور تماشہ کے جنگ کو دیکھ رہے تھے۔

فوج عثمانی چار حصوں میں منقسم کی گئی ہے، ہر ایک حصہ دوسرے سے آزاد ہے۔ ایک بلغاریہ کے خلاف، ایک سرویا کے، ایک قرہ طاغ کے، ایک یونان کے۔

چاروں حصوں میں ایک ایک کمان داں ہے۔ یہ چاروں کمان داں ناظم پاشا کے ماتحت ہیں۔

غرض سلطان المعظم نے جو تمام افواج کے سردار ہیں اپنا منصب ناظم پاشا کو تفویض کر دیا ہے۔ وہ **Generalissimo** ہوں گے اور قسطنطنیہ سے جنگ کے متعلق احکام جاری کریں گے۔

ان کے ماتحت چار کمان داں علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ وہ اپنے اپنے حلقوں میں رہیں گے اور ناظم پاشا کے حکم کے مطابق عمل پیرا ہوں گے۔ غرض جنگ قسطنطنیہ سے **Conduct** ہوگی۔

کل سہ پہر کو حضور جلالت مآب سلطان المعظم خاقان الاعظم سرعسکرت (وار آفس) تشریف لائے تھے کہ رضا کاروں **Volunteers** کو رخصت فرماویں۔

لاکھوں آدمی رضا کار بن کر گئے ہیں۔

اس وقت ہر چار عثمانیوں میں سے ایک برائے جنگ جا چکا ہے۔

خلائق کا ازدحام تھا۔حضور معمولی سپاہی ''نفر'' کی وردی میں آئے تھے۔ حضور کواس وردی میں دیکھ کر سپاہیوں کی جو حالت ہوئی ہے۔اس خوشی اور عزت کوان ہی سے پوچھنا چاہئے۔

چہرہ ہمایوں سے اطمینان اور قلبی خوشی کے آثار نمایاں تھے۔تمام سپاہیوں اور رضاکاروں کو''اے ہماری اولاد'' کے الفاظ سے خطاب فرمایا۔

تھوڑی دیر کے بعد روانگی شروع ہوئی۔ حریت اور ''سلطان سلامت رہیں'' کے ترانے بجنے لگے۔سپاہی تمام ساز وسامان سے لدے ہوئے ہاتھوں میں بندوقیں پہلوؤں میں تلواریں پیٹی میں کارتوس، کمر پر کھانے کے برتن کمبل اور اور ضروری چیزیں ایک طرف پانی کا فلزئی مشکیزہ دوسری طرف کچھ کھانا پے در پے قدم مارتے چلنا جس طرح کوئی مشین حرکت کرتی ہے۔حضور اقدس کے سامنے آنے پر ہاتھ سے سلام کرتے جاتے تھے۔ (ترکی فوج میں پادشاہ انور کو اس طور سلام کرتے ہیں) افسر برہنہ تلواریں ہاتھ میں سپاہیوں کی طرح لدے ہوئے تھے مگر ان کا بوجھ کا غذات، دوربین اور ضروری اشیاء کا تھا۔حضور کے سامنے آنے پر شمشیر کو سربسجود کردیتے تھے۔

اس کے بعد علَم مبارک آیا۔

اس سنجاق اسلام کا رنگ سرخ ہے اور کلمہ ''لاالہ الااللہ محمد الرسول اللہ''۔ دونوں جانب سنہری تحریر ہے اور اوپر ہلال آویزاں ہے۔ فوراً حضور نے عَلم کو سلام کیا، تمام کمانداروں نے اور ناظم پاشا نے سلام کیا۔ تمام باجوں نے ایک دم ایک مذہبی ترانہ شروع کر دیا۔ تمام فوجی افسروں نے تلواروں کو سجدے میں جھکا دیا۔ تمام مرد اور عورتیں جو بیٹھے تھے کھڑے ہو گئے اور تمام مخلوق نے عَلم کو سلام کیا۔

بادشاہ نے فوج کو خدا حافظ کہا اور ''نصر من اللہ وفتح قریب'' کہہ کر رخصت کیا۔

غرض یہ شرف اسلام کو سنبھالنے والے، تمام دنیا کے پس افتادہ مسلمانوں کی عزت کو قائم رکھنے والے، یہ دارالخلافت اسلام کے فرزند، یہ کعبۂ خدا اور کعبۂ رسول کی محافظت کرنے والے اس طور پر میدان جنگ کو سدھارے۔ اگر خدا ہے اور بیدار ہے سوتا نہیں تو یہ جلد بلقان کے تمام پایہ تختوں کو فتح کر کے سینٹ پیٹرس برگ (St. Petersberg) کو فتح کرنے کے لئے مراجعت کریں گے۔

یہ حالات محض آپ کی اطلاع کے لئے تحریر کرتا ہوں۔ اگر کسی رسالے وغیرہ میں لکھنے کا خیال ہوگا تو آئندہ تحریر کروں گا اور اطلاع دوں

گا۔

حضورامی جان مکرمہ مدظلہا کی خدمت میں دست بستہ آداب عرض ہےاورسب کوما وجب پہنچے۔

زیادہ حد ادب

عبدالرحمٰن

(۱۳)

روما،

۲۸ اکتوبر ۱۲ء

عالی حضور قبلہ وکعبہ ام مکرم محترم مدظلہ العالی

آداب۔ بعد صد آداب کے گذارش ہے۔ الحمداللہ میں بخیریت ہوں اورامید ہے کہ بحصول عریضہ مزاج عالی بہمہ وجوہ بسلامتی ہوگا اور جملہ خورد وکلاں مع الخیر خوش وخرم ہوں گے۔

امید ہے کہ جو عریضہ یونان کے ساحل سے جہاز پر سے ارسال کرچکا ہوں پہنچا ہوگا۔ جب جہاز برنڈسی پہنچا تو چونکہ برنڈسی میں کوئی شے قابل دیدنہیں ہے قیام کئے بغیر ریل میں سوار ہوکر نیپلز پہنچا۔

نیپلز (Naples) روما کے بعد اطالیہ میں سب سے عمدہ اور خوب

صورت شہر ہے۔ مگر جو چیز سب سے زیادہ مشہور اور قابل دید ہے وہ شہر پمپئی (Pompeii) کے آثار ہیں جو صدیوں کے بعد اس زمانے میں کھود کر نمودار کئے گئے ہیں۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے یہ شہر بسا بسایا کوہ وسوویس (Mt.Vesuvius) کی آتش باری میں لاوا اور خاکستر میں دب گیا تھا۔ شہر کا معتد بہ حصہ کھد چکا ہے مگر ہنوز بہت باقی ہے جس کو غالباً ایک اور صدی میں کھود پائیں گے۔ سب سے عجیب اور عبرت انگیز منظر گل بستہ مردوں اور عورتوں کی لاشیں ہیں جو جوں کی توں مٹی کے اور لاوا کے کفن میں لپٹی ہوئی سالم رہ گئی ہیں۔ شہر کی خوبی کسی جدید شہر سے کم نہیں۔ پمپئی کا شہر بیشتر خاکستر میں دب گیا تھا۔ لاوا اس پر بہت کم گذرا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور شہر تھا جس پر اب نیپلز کا ایک حصہ تعمیر ہے۔ اس کا نام ہرکولینیم (Herculanium) تھا۔ یہ تماماً لاوا میں دب گیا تھا اور چوں کہ خشک لاوا پتھر ہوتا ہے اس کو کھود کر نکالنا ناممکن ہے۔ صرف ایمفی تھیٹر (تماشہ گاہ) کو سرنگ بنا کر اندر ہی اندر کہیں کہیں سے نمودار کیا ہے اور زیر زمیں جا کر بہت عمق میں ان ظاہر شدہ حصوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

وہ شہر پمپئی کا تباہ کرنے والا کوہ آتش فشاں وسوویس نیپلز سے قریب ہی ہے۔ اب یہ تقریباً خاموش حالت میں ہے مگر کبھی کبھی دھواں اس سے

اب بھی نکلتا ہے۔اس کے قریب تک بھی گیا مگر زیادہ قریب جانا ممکن نہیں۔

مگر وسوویس حقیقت میں آتش فشاں پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے۔

ایک اور حصے میں جو اس کی قدیم مشتعل شدہ چوٹی سے دور اور شہر سے قریب ہے ایک اور پہاڑ ہے جس کو سلفرٹار (Sulphurtara) کہتے ہیں۔ یہ حقیقت میں دنیا بھر کے عجائبات میں ہے۔ اس آتش فشاں پہاڑ کی جوالا مکھی Crater کے اندر جاسکتے ہیں اور یہ جوالا مکھی محض آثار نہیں بلکہ بیدار حالت میں ہے۔

یہ جوالا مکھی طول اور عرض میں تمام بابو محلہ قدیم اور جدید کے برابر ہے۔ چاروں طرف پہاڑ پیالے کی طرح ہے اور بیچ میں میدان ہے۔ زمین کی کیفیت یہ ہے کہ خاک کی بجائے گندھک، سم الفار یا سنکھیا اور لاوا سے مرکب ہے۔ جابجا زمین میں رخنے بہتے ہوئے ناسوروں کی مثال ہیں۔ جن میں سے خاک آلود پانی یا کیچڑ ابل ابل کر بہتا ہے۔ جابجا زمین سے دھواں اٹھتا ہے۔ تمام زمین گرم اور تپتی ہوئی حالت میں ہے۔ ایک خاص حصے میں جہاں بہت زور ہے سنکھیا، گندھک اور لاوا ابل ابل کر نکلتا ہے گویا مائع آتش کی حالت میں ہے۔ اس جگہ پر اگر کوئی چیز جلائی جائے تو تمام جوالا مکھی سے دھواں اٹھتا ہے۔ چنانچہ جب ایک اخبار جلایا گیا تو ایسا معلوم ہوا

گویا تمام جوالا مکھی میں آگ لگی ہے۔ اور آتش فشانی شروع ہونے کو ہے۔ یہ میری رائے میں سب سے زیادہ قابل دید شے تمام اطالیہ میں ہے۔

ایک جزیرہ کاپری (Capri) نامی نہایت خوبصورت ہے۔ اس میں ایک پہاڑی راستہ ہے جس میں جب آفتاب چمکتا ہے تو چاندی اور سونے کے رنگ پانی میں نظر آتے ہیں اور نہایت دلفریب معلوم ہوتے ہیں۔

شہر میں ایک نہایت عمدہ پارک ہے جس میں بہت سے نفیس مرمر کے مجسمات استادہ ہیں۔ عجائب خانے پمپئی کی اشیاء کی وجہ سے مشہور ہیں۔

دو روز قیام کر کے تمام ضروری اشیاء کو دیکھ کر روم آیا ہوں ایک دن سیر کر چکا ہوں۔ ایک دو روز اور دیکھ کر یہاں سے وینس (Venice) جاؤں گا۔ فلارنس کا قصد چھوڑ دیا ہے کیوں کہ تاخیر کا خیال ہے۔ وینس سے جرمنی اور وہاں سے لندن جاؤں گا۔

امید ہے کہ بحصول عریضہ مزاج گرامی بہمہ وجوہ بسلامتی ہوگا اور سب طرح خیریت ہوگی۔

خطوط انشاء اللہ وینس میں ملیں گے اور بفضلہٖ امید ہے کہ بہمہ وجوہ خیریت ہوگی۔

جنگ بلقان کی کوئی صحیح خبر نہیں۔ یہاں کے اخبار سخت اندیشہ ناک خبریں شائع کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ناصر اور معاون ہو۔

اتنا معلوم ہے کہ ادرنہ (ادریا نوپل) میں ایک بہت بڑی لڑائی ہوگی اور اس کے انجام پر مسلمانوں کا مستقبل مبنی ہے۔ اللہ مسلمانوں کا حامی اور مددگار ہو۔

روشن آراء اور بشیر الدین کی کیفیت صحت سے بھی اطلاع دیجئے، ہمیشہ ان کی جانب سے تشویش رہتی ہے۔

اور سب حالات بدستور ہیں۔ حضور امی جان مکرمہ مدظلہا کی خدمت میں آداب۔ سب کو ماد جب۔

زیادہ حد ادب عبدالرحمٰن

(۱۴)

وینس، اطالیہ
یکم نومبر ۱۲ء

عالی حضور قبلہ و کعبہ ام مکرم محترم مدظلہ العالی

آداب دست بستہ گذارش ہے۔

یہاں پہنچ کر تین ہفتوں کے والا نامجات یکجا موصول ہوئے۔ سب

سے خیر و عافیت اور سلامتیٔ مزاج وہاج دریافت ہوکر اطمینان ہوا اور خوشی حاصل ہوئی۔ الحمد اللہ میں بھی بخیریت ہوں۔ آج یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا اور یہاں سے انشاءاللہ براہ راست ایک روز میں فرائی برگ پہنچ جاؤں گا، وہاں نام درج کرانے کے بعد جو ہر ششماہی کے آغاز پر حسب دستور لازمی ہے، لندن روانہ ہو جاؤں گا۔

امید ہے کہ بحصول عریضہ جملہ خورد وکلاں بخیر ہوں گے اور ہر طرح خیریت ہوگی۔

عبدالولی خاں کی نسبت جو آپ نے دریافت فرمایا ہے، اسلامبول میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی، یہ ہندوستان کے دو اخباروں زمیندار، کامریڈ کی نامہ نگاری کرتے تھے اور چونکہ انہوں نے جہاد طرابلس میں جانے کے لئے عرضی دے رکھی تھی اس لئے ان کی فوجی افسروں تک رسائی وغیرہ تھی۔

چنانچہ ان کی درخواست منظور ہوگئی اور چونکہ آخری دن یہ مجھے بلا کر اپنے ہمراہ محکمہ حربیہ War Office میں لے گئے تھے اور اتفاقاً ترجمان سرکاری اس وقت کوئی موجود نہ تھا، ناظم پاشا وزیر جنگ کے اسٹاف افسر کے اور ان کے درمیان میں ترجمان ہوا۔ ان کو ادرنہ غازی انور بے کے پاس

روانہ کیا گیا اور سات سو پچاس روپے -/750 (پچاس پونڈ) زادِراہ کے طور پر دیئے گئے۔ اور مزید ہدایات زبانی کی گئیں۔

دو روز بعد یہ روانہ ہو گئے۔

اب اللہ جانے کہ جہاد پر گئے یا خدانخواستہ ترکوں اور ان کی سلطنت کو دھوکا دیا۔ ظن المومنین خیرا۔

اس کے علاوہ ان کی موجودگی کے زمانے میں ہی یہ مضمون جو زمیندار میں درج ہے اسلامبول کے اخبار صباح نے شائع کیا تھا مگر جیسا کہ یمنی بے، ایڈیکانگ (ADC) وزیراعظم نے اسی روز جس دن مذکورہ بالا گفتگو ہوئی تھی کہا، وزیراعظم پاشا کے نام بہت سے تار ہندوستان سے تردید میں آ گئے تھے جن میں درج تھا کہ یہ درحقیقت مجاہد اسلام اور محب ملت ہیں اور ان کو اطمینان ہو گیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مگر ان کی مالی حالت یہاں بھی درست نہیں تھی تاہم مجھ کو کسی قسم کا دھوکہ نہ انہوں نے دیا اور نہ کوئی ایسا موقع ہی ہوا۔

مجھے خود اس امر کے دریافت کی کاوش ہے کہ آیا یہ درحقیقت طرابلس گئے یا نہیں۔

عید قسطنطنیہ میں بھی یوم جمعہ ہی کو ہوئی تھی۔

انشاء اللہ فرائی برگ یا لندن پہنچنے پر اپنی تصویر کھنچوا کر روانہ کروں گا۔ جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔ صحت الحمد اللہ اچھی ہے۔

صحیفہ گرامی مرسلہ ۲-۱۰-۱۲ء میں حضور نے خطوط کے وقت پر نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامبول کے قیام کے زمانے میں میں شب و روز پھرتا ہی رہتا تھا اس لئے اکثر ترسیل خطوط میں بے ترتیبی ہوتی رہی۔ امید ہے کہ اس کے بعد خطوط ہر ہفتے پہنچتے رہے ہوں گے۔

امید ہے کہ چنو میاں کا اجازت نامہ لاہور سے آ گیا ہوگا اور مع الخیر علی گڑھ ہو نگے۔

خان بہادر امام شریف صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر نہایت ہی رنج و افسوس ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بہت خوب آدمی تھے۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے۔

میرا قصد تھا کہ چار پانچ مستقل مضامین انگریزی میں ترکی کے متعلق کامریڈ میں اقتصادی، علمی، سیاسی، مذہبی حالت پر لکھوں مگر اس جنگ نے سب لکھے لکھائے مضامین بیکار کر دیئے اور سوائے اس کے کہ اُن کو جلا کر ان کا تماشا دیکھتا کچھ نہ کر سکا۔ حقیقت میں بلقان اور یورپ نے ثابت کر دیا کہ خدا نے کم از کم حال فی الحال مسلمانوں کو چھوڑ دیا ہے۔

واللہ باللہ ترکوں کا شکست کھانا صرف ایک حادثۂ الٰہی ہے ورنہ اب بھی میں پھر وہی کہتا ہوں کہ جہاں تک عالم اسباب کو دخل ہے، اب بھی ترکوں کی فوج میں پانچ بلقان کی قوت موجود ہے۔

اب مسلمانوں کی وہ حالت پہنچ گئی سمجھنا چاہئے جو بنی اسرائیل کی تھی۔ نصرانیت نے اسلام اور الحاد نے مذہب کو شکست اور شکست فاش دی۔

اب مسلمانوں کا مجموعی طور پر یا فرداً فرداً زندہ رہنا بے شرمی اور بے حیائی سے زیادہ نہیں۔

عمائدین، شیخ الاسلام وغیرہ کی ملاقاتوں میں کوئی خاص دلچسپ بات نہ تھی جو تحریر کرتا۔ شیخ الاسلام کی ملاقات پر بھی ایک مضمون لکھا تھا وہ بھی تلف کردیا۔

اب تو یہ کیفیت ہے کہ ایک ہفتہ بھر سے شب میں نیند بہت کم آتی ہے۔ جب دن میں اطالیوں کی صورتیں دیکھتا ہوں تو اور زیادہ جنون پیدا ہوتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں چلا جاؤں جو آرام نصیب ہو۔ الٰہی! کہاں میں جا کر رہوں کہ مجھ کو سکون حاصل کوئی گھڑی ہو۔

جو مضمون میں نے آپ کی خدمت میں روانہ کئے تھے وہ تمام تر

سرسری تحریریں تھیں جن کی عبارت ازسرتا پا غلط ہے اور جن کے نفس مضمون میں بھی کامل صحت کے لئے از حد تبدیلی کی حاجت ہے اور وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آپ اُن کو کسی کو دکھائیں۔ محض اطلاع دہی کے لئے عجلت میں اُن کو لکھا گیا ہے۔ یہی حالت اُس کے بعد سفروں کے متعلق خطوط کی ہے۔

نیپلز تک مختصر حال لکھ چکا تھا۔

نیپلز سے روما آیا اور روما میں دو دن سے کچھ بیشتر قیام کیا۔

روما میں قدیم اہل روما کے آثار دیکھے۔ چوں کہ قرون وسطیٰ میں جب یورپ کا زمانۂ جہالت تھا اور کلیسا کے استبداد نے ہر غیر عیسوی شے کو ممنوع کر رکھا تھا، اہل روما کے تمام معبد تباہ کر دیئے گئے تھے اور اُن کے پتھروں سے کلیسا تعمیر کر لئے گئے تھے اس لئے یہ آثار بہت زیادہ نہیں ہیں۔ چند عمارات ہیں جو مختلف وجوہات سے بچ رہی ہیں۔ بادشاہوں کے چند مجسمات ہیں جن کو اس وجہ سے یا اس اشتباہ میں کہ یہ قسطنطین (اول عیسائی بادشاہ روما) یا اس کے عیسائی جانشینوں سے متعلق ہیں، سلامت رہنے دیا ہے۔ علاوہ ازیں بیشتر بت اور سنگین تصاویریں ہیں جو زیر زمین مدفون ہو جانے کے باعث بت شکنوں کے دست تعدی سے بچ رہی ہیں۔ یہ اشیاء اب عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔

قدیم عمارات میں ایک عمارت کیپٹل (Capital) کی ہے، اس کا صرف چبوترہ باقی رہ گیا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر قدیم فورم (Forum) کے آثار شکستہ ہیں۔ اس میں مختلف عدالتوں کے ایوان ہیں۔ چاروں کونوں پر چار معبد گاہوں کے ستون اب تک شکستہ اور ریختہ حالت میں استادہ ہیں۔

بیچ میں شارعات ہیں جن کے کناروں پر ستون قایم ہیں جن پر ایک زمانے میں مشاہیر روما کے مجسمات نصب تھے۔

ایک طرف وہ جگہ ہے جہاں پر مارک انطونی نے جولیس سیزر کی لاش پر تقریر کر کے ملک میں بغاوت برپا کردی تھی اور سلطنت جمہوریہ کا خاتمہ کر دیا تھا۔

ان آثار سے آگے تولیسیم (Coliseum) ہے۔ یہ قدیم اہل روما کی تماشا گاہ تھی۔ یہ مدوّر شکل میں ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ نہ پوچھئے۔ اس پر تمام وکمال اندر و باہر سنگ مرمر کی تہ تھی مگر اب مرمر تمام دستبرد وقت سے ضائع ہو گیا ہے۔ نیچے کی جانب درندوں اور غلاموں کے باہر لائے جانے اور اندر لے جانے کے راستے ہیں۔ سامنے بادشاہ کی نشست ہے۔ اس سے اوپر مقدس دوشیزگاں (Vestal Virgins) کی نشست گاہ ہے۔ ومعہذا اوپر

تک بیٹھنے کے مقامات مقرر اور علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں۔ چھت ضائع ہو چکی ہے۔

یہاں پر اہل روما شیروں اور درندوں کی آپس میں، شیروں اور درندوں کی غلاموں سے اور غلاموں کی آپس میں جنگ دیکھنے کے لئے جمع ہوا کرتے تھے اور جب تک درندہ یا غلام یا غلاموں میں سے ایک مر نہ جاتا تھا جنگ جاری رہتی تھی۔

یہ عمارت حقیقت میں عجائبات فن تعمیر سے ہے۔ قدیم عمارات میں سے ایک اور قابل تذکرہ کالیگلا بادشاہ (Caligula, Gaius Caesar) کے حمام ہیں۔ اُن کی بلندی، عظمت اور خوبی بیان سے بالا ہے۔

طرز تعمیر روما کا یوں سمجھنا چاہئے کہ یونانی ہے مگر انہوں نے قوس اور محراب کے استعمال کو زائد کر کے ایک خاص طرز اپنا پیدا کر لیا ہے۔ جو اب ان سے منسوب ہے۔

روما میں شاہی محل کو دیکھا۔ عمارت باہر سے از حد ردی ہے، اندر سے خوب آراستہ و پیراستہ ہے، سرخ، زرد، آسمانی، گلابی رنگوں کے کمرے ہیں جن میں ہر چیز انہی رنگوں کی ہے۔

جدید عمارات میں سب سے قابل ذکر آیہ پطرس (St.Peter's) کا کلیسا ہے جو کلیسائے پوپ کا سب سے بڑا گرجا اور تمام دنیا میں سب سے

بڑا مسیحی معبد ہے۔ یہ آیہ صوفیہ جامع سے دگنے سے زیادہ اور لندن کے آیہ پال (St.Paul) سے بڑا ہے۔ اس کی عمارت کی شان اور خوبی حقیقت میں یورپ اور کلیسائے روما کی امارت پر گواہ ہے۔ اس کے اندر سینکڑوں مرمر کے مجسمات ہیں جن میں سے ہر ایک کی قیمت لاکھوں روپے ہے۔ تمام سنگ مرمر کی عمارت ہے، جا بجا سونے کا کام ہے۔

اس جگہ جہاں یہ گرجا قائم ہے پطرس کو قتل کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس انتقام کے لئے قدیم اہل روما کے خدا (مریخ) کے بت کو پگھلا کر پطرس کا بت بنایا ہے جو گرجا میں رکھا ہے۔ تمام عیسائی اس کے پیر کو بوسہ دیتے ہیں۔ بوسہ دینے سے یہ پیر آدھے کے قریب گھس گیا ہے۔

اس گرجا کے عقب میں Vatican ہے جہاں پوپ رہتا ہے۔

واٹی کان (Vatican) میں دنیا کا ایک مشہور ترین عجائب خانہ ہے جہاں قدیم اہل روما کے مجسمات وغیرہ ہیں۔ اس کو دیکھا اور حسب تعریف پایا۔

پوپ اپنے آپ کو اطالیہ میں مقید تصور کرتا ہے اور حکومت اطالیہ سے برسرِ صلح نہیں ہے۔ چنانچہ واٹی کان میں پوپ کے اپنے سپاہی اور گارڈ والے ہیں جن کی وردی وغیرہ بالکل علیٰحدہ ہے۔ مگر وہ اس وردی میں

واٹی کان سے باہر نہیں آسکتے۔ اسی طور کوئی سرکاری افسر یا سپاہی وردی میں جو سرکاری آدمی ہونے کی علامت ہے، واٹی کان میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہ ناموافقت عرصے سے یوں ہی چلی آتی ہے۔

ایک اور نہایت قابل دید شے موجودہ بادشاہ کے دادا کا بت ہے جو از حد بلند اور شاندار بنایا گیا ہے۔ سینٹ پیٹر کا گرجا اور یہ بت دو ایسی تعمیرات ہیں جو زمانہ مستقبل میں موجودہ اطالیہ کی یادگار رہ جائیں گی۔

اس کے علاوہ سینٹ پال کا گرجا ہے جہاں سینٹ پال کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ ایک مرتبہ آتشزدگی سے تلف ہو گیا تھا اب دوبارہ بنایا جا رہا ہے اور نہایت شاندار ہے۔ اس میں چھ ستون الاباسٹر (Alabaster) کے ہیں جو محمد علی خدیو مصر نے تحفتاً پوپ کو دئے ہیں۔

روم نہایت پر رونق شہر ہے۔ موجودہ زمانے میں فنون لطیفہ کے لئے مشہور ہے۔ یہاں فن موسیقی اور مجسمہ سازی اور مصوّری کے بہترین مدارس ہیں۔ یہاں کے جدید فن مصوّری کی اکیڈمی کو بھی دیکھا اور خوب پایا۔

روم سے میرا قصد فلورنس کا تھا مگر وقت کی قلت کی وجہ سے ارادہ ترک کرنا پڑا۔ روم سے سیدھا وینس آیا۔

یہ شہر بھی روما کی طرح ایک بڑی عظیم الشان حکومت کا پایہ تخت رہ

چکا ہے۔

مگر جس وجہ سے یہ ملکہ امصار کہلاتا ہے وہ یہ ہے کہ شہر وینس معہ گردونواحات کے ایک سوتیں کے قریب چھوٹے چھوٹے، قریب قریب واقع شدہ جزیروں سے بنا ہے۔ چنانچہ اس شہر میں بجائے شارعات کے نہریں ہیں اور ایک مکان سے دوسرے مکان میں جانے یا ایک طرف سے دوسری طرف گزرنے کے لئے کشتی یا پل پر سے جانا ضروری ہے۔

ہر مکان کے سامنے ایک کشتی استادہ ہے اور لوگ ہر وقت ادھر اُدھر کشتیوں میں آتے جاتے ہیں۔

کشتیاں سرکاری حکم سے ایک خاص نمونے پر بنائی گئی ہیں اور سب کا رنگ سیاہ ہے۔

اس کی کیفیت حقیقتاً دیکھنے سے متعلق ہے بیان میں نہیں آسکتی۔

دیکھنے کی اور چیزیں یہاں پر بعض کلیسا ہیں اور دو ایک محل ہیں مگر آج کل یہاں ایک یورپی بین الاقوامی (International) مصوری اور مجسمہ سازی کی نمائش ہو رہی ہے جو کمال دلچسپ ہے۔

ایک اور چیز جو یہاں پر دیکھی وہ شیشہ سازی کے کارخانے ہیں۔ وینس کے شیشہ ساز دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ تمام کام ہاتھ سے ہوتا ہے اور

دمِ شیشہ سازتن ِبلور میں مسیحائی کا کام کرتا ہے اور جو شکل چاہتا ہے شیشے کو دے دیتا ہے۔ ہاتھ کی صفائی اور سبک کاری جو اس کام کے لئے لازمی ہے واقعی برسوں ہی کی مشق سے حاصل ہوتی ہوگی۔

یہاں پر ہر قسم کی تجارت بے شمار ہوتی ہے اور غیر ممالک کے لوگوں کی ازحد کثرت ہے۔ انگریز یہاں بہت زیادہ ہیں۔

اطالیہ میں آکر یہ دریافت ہوا اور دیکھا کہ انگریزوں اور اطالویوں میں خاص دوستی اور تعلق ہے۔ اتنی دوستی میں نے انگریزوں اور انگریزوں میں نہیں دیکھی جتنی انگریزوں اور اطالویوں میں پائی جاتی ہے۔

اب میں یہاں سے جا رہا ہوں اور انشاء اللہ جلد لندن براہ فرائی برگ پہنچ جاؤں گا۔

عبدالستار صدیقی علی گڑھ کالج کے طالب علم جو جرمنی، عربی کی تعلیم کے لئے آئے ہیں فرائی برگ (Freiburg) سے قریب ہی اشتراس برگ (Strasbourg) کی یونیورسٹی میں داخل ہوئے ہیں۔ یہ بہت معقول شخص ہیں، امید ہے ملاقات ہوگی۔

اور سب حالات بدستور ہیں۔

حضور امی جان مکرمہ مدظلہا کی خدمت میں دست بستہ آداب عرض ہے۔

اور سب کو ماوجب پہنچے۔ ہمیشہ عافیت کا جویاں ہوں۔

زیادہ حدادب

عبدالرحمٰن

(۱۵)

برلن

مکرمی و محبی سلامت۔

پس از بلاغ مراسم نیازمندی واضح خاطر گرامی ہو کہ صحیفۂ گرامی مصدرہ ۲ جولائی واصل ہوا، سلامتی مزاج سے واقفیت ہو کر خوشی ہوئی اور دوستوں کی خیریت سے مسرت، امید ہے کہ بحصول اس عریضے کے آپ بہمہ وجوہ بخیریت ہوں گے۔

الحمدللہ میں اچھا ہوں۔ میری نسبت جو دریافت فرمایا ہے سو میں ہنوز جرمن زبان سیکھنے میں ہی مصروف ہوں، فرائی برگ کی یونیورسٹی میں بھی شامل ہوں مگر لیکچر وغیرہ سمجھ نہیں سکتا، قانون ہی میں مزید تگ ودو کا قصد ہے اور ڈپلومیسی مضمون لینے کا ارادہ ہے۔

بدرالدین صاحب کا وعظ 'پردے' پر اب تک موصول نہیں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کوئی کتاب لکھ کر بھیجیں گے یا ''مخزن'' میں کھلی چھٹی شائع

کریں گے، مگراس کی بناسوائے حسد کے کوئی اور شے نہیں جو ہندوستان کے مردوں کی طبیعت میں ودیعت ہے۔

یونیورسٹی کے متعلق یہ سن کر کہ اب تک آئین شائع نہیں ہوااور جملہ آئین دونشستوں میں بن کر رہ گیاسخت افسوس ہے۔خدا ہی ہے جو سوائے زمانے کی خندہ زنی کے کچھ اور نتیجہ برآمد ہو۔آپ جو یہ لکھتے ہیں کہ لندن میں لوگوں سے کہا جائے کہ زیادہ آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں تو اے برادرِعزیزاز جان! وہ لوگ کون ہیں؟ ہز ہائنس سر آغا خان کی رائے تو معلوم ہی ہے، رہے آنریبل جسٹس امیر علی صاحب سو وہ قوم کے سب سے بڑے لیڈر ہیں اور چونکہ دور رہتے ہیں، اُفق ہندوستان پر سورج کی طرح چمکتے ہیں مگر شاید اوروں سے کسی قدر آگے ہی رہتے ہیں پیچھے نہیں رہتے۔

اگر کچھ ہے، سچائی کہئے، اخلاقی جرأت کہئے تو وقارالملک میں۔اگر ان میں نہیں تو قوم میں نہیں، خدا سے دعا مانگئے کہ اِس امّت کو تباہ ہی کر دے۔

محمود صاحب کو میں آپ کے خط کے متعلق لکھوں گا۔عرصے سے ان کا خط میرے پاس نہیں آیا، غالباً اب تک شاید انہوں نے آپ کو جواب بھی روانہ کر دیا ہو۔انہوں نے اپنی کتاب مغلوں کے سیاسی نظامِ حکومت

کے متعلق لکھ کر پیش کردی ہے اور مقبول ہوگئی ہے۔ جرمن اور لندن کے پروفیسروں نے اس کی تعریف بھی کی ہے۔ چند امتحانات دینے پر ڈگری مل جائے گی۔ غالباً اسی باعث شدت کار اُن کی خاموشی کا سبب ہے۔

مولانا عبدالخالق صاحب کی مبارکباد پہنچ گئی۔ میں سمجھ گیا بیرسٹری کے انتخابات میں نمایاں کامیابی کے حصول سے متعلق ہے، یہی امر ہے نا؟ سومیرا تو ہمیشہ سے مسٹر گلیڈ اسٹون (Gladstone) کا اصول ہے کہ درجہ چہارم نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً درجہ سوم میں سفر کرتے تھے، اس سے زیادہ بہرہ ہی نہیں۔

ظہیر صاحب کی علالت سے تفکر ہوا، ان کی کیفیت مزاج سے اطلاع دیجئے اور اگر خط لکھئے تو میرا اسلام ضرور تحریر کیجئے۔ یہ بھی لکھئے کہ اگر انہیں فرصت ہو تو کبھی کبھی مجھے خط سے یاد فرماتے رہیں۔ اور اپنے دوستوں کے اور کالج اور قوم کے حالات سے اطلاع فرماتے رہئے۔ ہمیشہ آپ کی خیریت کا جویا ہوں۔ مفصل حالات سے مطلع کیجئے گا۔ زیادہ سلامِ شوق عرض ہے۔

عبدالرحمٰن

(۱۶)

برلن۔

اے برادرِ شفیق و یارِ صدیق!

سب شکایتیں بجا، میری کوتاہ قلمی نا قابلِ معافی ہے مگر مجبور ہوں بلکہ معذور۔ تاخیر ہے تقصیر نہیں۔ اول تو ویسے ہی مجھے خط لکھنے سے بہرہ نہ تھا، یہاں کی مصروفیت نے بہانہ پیدا کر دیا، مگر گو اس قدر خاموش ضرور رہا آپ کے خیال سے کبھی غافل نہیں ہوا۔

زندگی کا بہترین زمانہ آپ ہی کی محبت اور دوستی میں گذارا، اب ویسا وقت پھر نہیں آنے کا۔ پھر اگر میں زندہ پھرا، ملیں گے۔ مگر غمِ دنیا سے نجات، زنجیرِ علائق سے آزادی، کالج اور جوانی کہاں؟ غرض ساقیِ زمانہ آتش بجام کر چکا، البتہ اُس بزم کی یاد مغتنم ہے۔

یورپ کے حالات کے آپ بہت جویاں اور شائق ہیں مگر اُن کو بیان کرنا یا تحریر میں لانا محض راقم کا اپنی ناواقفیت پر مہرِ شہادت ثبت کرنا اور مخاطب کو غلطی میں ڈالنا ہے۔ میں لکھوں تو کیا لکھوں؟ انشاء اللہ آپ خود ایک روز آ کر دیکھ لیں گے۔

مشرق میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن اگر مشرق مغرب سے بالا ہوتا

تو آفتاب مشرق یوں غروب نہ ہو جاتا۔فوق اُسی کو ہے جو بہتر ہے،ماسوااور مضامین کے یہ بحث مسلۂ حجاب پر بھی صادق ہے۔آپ کے خط کا منتظر ہوں کہ آپ کیا لکھتے ہیں۔ہمارے (یعنی آپ کے) جملہ دلائل کا سہ آتشہ عطر یہ ہے کہ مذہب کے خلاف ہے،غلط،تاریخ سے ثابت ہے،غلط،شیرازہ ریزی کا خوف ہے،اس دلیل کی بنیاد حسد پر ہے۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

پردے میں تعلیم! اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا سینا پرونا؟ شیخ عبداللہ اور مولوی سعید احمد دہلوی کے مجوزہ نصاب دیکھ لینا تعلیم ہے؟

تعلیم وہ شے ہے،جو ہنوز یورپ میں بھی عورتوں کو پوری آزادی سے حاصل نہیں البتہ ہونے والی ہے،یعنی سیاست،تمدن،معاشرت،صلح، جنگ،ہر بات میں ان کو حسب لیاقت مردوں کی مساوات اور اُن سے فوق لے جانے کی اجازت ہو،قانون دونوں کے لئے ایک ہو۔

پس اُس خوف کو بالائے طاق رکھئے۔خدا جو مردوں کو معاف کرتا ہے عورتوں کو بھی معاف کرنے والا ہے۔اُس کی نظر میں دونوں ایک ہیں۔

یونیورسٹی کے متعلق میں کیا کہہ یا کرسکتا ہوں۔رہا ''ہم'' سو ہم

کہاں؟ میں دور افتادہ تو صرف ''میں'' ہی ہوں، کام اس قدر ہے فرصت اس قدر قلیل ہے کہ دم لینے تک کو موقع نہیں۔ لندن چھ مہینے رہا، اب تک شہر تک نہیں دیکھا۔ برلن ایک ماہ سے زائد پہلے رہ چکا ہوں اب پھر آیا ہوں، کچھ دیکھنے کی فرصت نہیں، مگر وقت اس قدر کم ہے کہ جو کرنا چاہتا ہوں ممکن نظر نہیں آتا۔

یہ یونیورسٹی تو یوں ہی بنے گی۔ میرے یا آپ کے کرنے سے کچھ نہیں ہوسکتا، مگر ملک ہند تو ایک براعظم ہے اور یونیورسٹیاں کم از کم سو تک بنانے کی گنجائش ہے۔

امیر علی صاحب کے متعلق آپ نے کچھ تحریر فرمایا ہے، سو بھائی جان! بارہا گفتہ ام و بار دگر میگویم، کہ بعد سید احمد خاں کے (کہ وہ بانی تھے) کوئی شخص مشتاق حسین سے زیادہ ''سچا'' مسلمانوں میں نہیں۔ اگر ان میں عیب ہیں تو اوروں میں لاکھ گنا ہیں۔ سارے عالم کو آزما دیکھا، جس کو دیکھا سو بیوفا دیکھا۔ البتہ مذہبی ''سختی'' اُن میں بہت بے جا اور اندیشہ ناک ہے۔ سو ان کی فطرت میں ہے، کوئی چارہ نہیں۔ جملہ امور متعلقہ کالج کی اطلاع دیتے رہئے۔

اس خط میں چوں کہ باتیں کم وبیش درج ہیں اس لئے ملتجی ہوں کہ

اس کو چاک فرما دیجئے۔ مانا کہ قانوناً اس پر آپ کو اختیار ہے مگر اخلاقاً آپ کو تاکید ہے، نیز اس تحریر کے مخاطب آپ ہیں اس لئے کسی اور کو اس میں شامل ضیافت نہ کیجئے، گواسے آپ فہم وذکا میں کیسا ہی صاحب رائے سمجھتے ہوں، ورنہ غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔

اور لکھتا مگر صفحہ ختم ہوا اور نیز ایک خفتہ درد جسم ناتواں میں اچانک پیدا ہو گیا اور میں مجبور۔ فقط۔

عبدالرحمٰن

(۱۷)

کامن روم،

لنکنز اِن،

۱۰ جنوری ۱۹۱۳ء

میرے عزیز محمود!

آپ کے ۱۸ دسمبر ۱۲ء کے خط کے لئے بہت بہت شکریہ۔ آخر کار آپ کے اور آپ کی خیریت کے بارے میں اطلاع پا کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

مجھے یہ سن کر بڑا اطمینان ہوا کہ آپ کا بانکی پور جانے کا ارادہ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ وہاں بڑی کامیابی کے ساتھ جم سکیں گے اور اقبال مند ہوں گے۔

میرے عزیز دوست، آپ کے لئے ضروری نہیں تھا کہ آپ میرے لئے اپنی پرخلوص دوستی کا یقین دلائیں۔ اب تک تو آپ کا برادرانہ خلوص جیسا کہ پہلے ہی دن سے ہوا ہے، میرے دل میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ میری ہمیشہ سے آپ کے ساتھ ایک نسبت ہے اور وہ ہمیشہ رہے گی، اس بارے میں نہ تو کوئی سوال اٹھا ہے اور نہ اٹھ سکتا ہے۔

دوست اور پھر دوست بھی سچا، عجب نعمت ہے یہ
ہو نہیں سکتا بدل، اک دوست کا سارا جہاں

کالج (ایم۔اے۔او کالج) میں پروفیسری حاصل کرنے کی میری خواہش اس وجہ سے تھی کہ مجھے لکھنے پڑھنے کے لئے سکون اور فرصت مل سکے۔ میں زندگی کا سامنا کرنے سے نہیں ڈرتا لیکن میں دنیا سے اپنے قلم کی مدد سے لڑنا چاہتا ہوں۔

محمود، کیا آپ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر آپ نہیں دیکھیں گے تو پھر کون دیکھے گا۔ اگر آپ کسی خاص نقطۂ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں، میں اپنے آپ کو قربان کردوں گا تو ایک دوست کی حیثیت

سے آپ کو عمداً مجھے اس پر آمادہ کرنا چاہئے کہ میں ایک اچھے مقصد کی خاطر اپنی قربانی پیش کروں۔

مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اگر میں وکالت کروں گا تو میرے اندر کی بعض ایسی صلاحیتیں جن میں، جیسا میں سوچتا ہوں، کچھ دم ہے جلد ہی فنا ہو جائیں گی اور عبدالرحمن نہ بچے گا۔

میں نے یہ بات اتنی کھل کر اس لئے لکھ دی کہ یہ میرے لئے نہایت ضروری تھا کہ اس وقت جب کہ میں اپنی زندگی کے ایک موڑ پر کھڑا ہوں میں اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔

میں نہ صرف آپ کی مدد کا خواہش مند ہوں بلکہ یہ بھی چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ کھڑے ہو کر میری حمایت میں بولیں اور ہمیشہ اور ہر حالت میں آپ اعلان کریں کہ میں وہی کر رہا ہوں جو صحیح ہے۔ اور مستقبل میں بھی چاہے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہوں یا اسے حاصل کرنے میں اپنی نااہلی یا کم علمی کی وجہ سے ناکام رہتا ہوں۔

آپ نے جو پیش کش کی ہے اُس پر پھر سے آتے ہوئے میں پھر آپ کے لئے اپنی شکر گذاری کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تھوڑا بہت اُن ''نوجوان بیرسٹروں'' کے بارے میں معلوم ہے جن کی پیش کش کو آپ نے

ٹھکرادیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں سے ایک لائق باپ کے لائق فرزند ہیں اور ان کا آپ کے ساتھ کام کرنا آپ کے لئے بھی کچھ کم فائدہ مند نہیں ہوتا۔ ایک اور کے ساتھ ان کے حق میں بڑی اچھی سفارش تھی۔ تیسرے، مراسم کے لحاظ سے آپ کے بہت قریب تھے۔ جب میں یہ سوچتا ہوں تو میری آپ کے ساتھ وابستگی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ مزید میرا آپ کے ساتھ آجانے کا مطلب یہ ہوتا کہ آپ کے گھر میں ایک کا نہیں چار لوگوں کا اضافہ ہوجاتا۔ میری اہلیہ اور بچوں کو ملا کر۔

اور کوئی قابلِ ذکر خبر نہیں۔ ترکی پر بڑے برے دن آگئے ہیں۔ ایک طرف تو وہ سمندر پار سے اپنی بیرونی ریاستوں کا نشانہ ہے اور بلا استثنا سارے یورپ کے ممالک جو آمادۂ جنگ ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنے اندرونی دشمنوں کا شکار ہے یعنی کمال اور ان کے رفقا کا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ترکی کا حال بھی علی گڑھ کالج جیسا ہے۔ موجودہ وزارت (ترکی کی) ہمارے پرانے ٹرسٹیوں کے مثل ہے، کمزور، ساکت اور ضعیف العقل۔ دوسری جانب اتحادی، کالج کے انگریز اسٹاف کی طرح ہیں۔ یورپ کو ہماری گورنمنٹ سمجھ لیں۔ کمیٹی برائے اتحاد و ترقی، طلبہ کی طرح ہے۔

اگر کمیٹی کو موقع ملتا تو ایک جنگ اور ہوتی۔ اسی طرح اس بات کا

امکان تھا کہ ترکوں کو یورپ چھوڑنا پڑتا لیکن یہ پسپائی ایسی ہوتی جس سے ان کی عزت کو دھبا نہیں لگتا۔ لیکن اب "بہرے، گونگے اور اندھے" وزیروں کی عنایت سے وہ ذلت کے ساتھ دھول چاٹ رہے ہیں۔

کیا ترکی پھر اپنا سر اونچا کر پائے گا؟ ہاں۔ ترکی ایک پیچیدہ تنظیم ہے۔ اس کے پرانے عناصر دَم توڑ رہے ہیں اور نئے جنم لینے کی کش مکش میں ہیں۔ عرب آگے قدم بڑھا رہا ہے۔ ترک پیچھے ہٹ رہا ہے۔ ترک کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی اور وہ پس منظر میں چلا جائے گا۔ عرب لگام اپنے ہاتھ میں تھام لے گا اور سامنے نکل آئے گا۔ سیدھے سادے ترک کی جگہ پُر پیچ عرب لے لے گا اور اس میں یورپ کو اپنا ہمسر یا شاید اپنے سے زیادہ فوقیت رکھنے والا ملے گا۔۔۔ یہی میں پیشین گوئی کر سکتا ہوں۔

اگر ایسا نہیں ہوتا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہمارے ذہن کو مصروف رکھنے کے لئے جو بات ضروری ہے وہ صرف جدوجہد ہے نہ کہ وجود۔

سہروردی اور حسین صاحبان بخیر ہیں۔

آپ کی بہترین صحت کی توقع اور آپ کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہوئے میں ہوں آپ کا مخلص۔ عبدالرحمن۔

نوٹ :۔ ڈاکٹر سید محمود (فرزند سر سیّد احمد خان) ایم۔اے، او کالج ،علیگڑھ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے ہم عصروں اور دوستوں میں سے تھے۔ کالج چھوڑنے کے بعد بھی ان دونوں کا رابطہ برقرار رہا اور ان کے درمیان خلوص کا کیا رشتہ تھا اُس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ انگریزی خط کا ترجمہ ہے جو ''ہماری زبان'' دہلی کے یکم جولائی ۱۹۹۲ء کے شمارے میں ڈاکٹر سید حامد حسین کے توسط سے شائع ہوا ہے۔ اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ ڈاکٹر سید محمود نے بجنوری کو انگلستان سے بیرسٹری حاصل کر کے لوٹنے پر اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن بجنوری نے اپنی ادبی دلچسپیوں کے پیش نظر وکالت کے پیشے کے ساتھ وابستہ ہونے میں تامل کا اظہار کیا۔

(۱۸)

آکسفورڈ،

۱۳ جون ۱۳ء

محبّ و مولائے من

تسلیم۔ از حد شرمندہ ہوں کہ آپ کے والا نامہ جات کے جواب میں صرف عذر کے دو حرف لکھ رہا ہوں۔ جلد لندن آ رہا ہوں۔ اس وقت

مفصل گفتگو ہوگی۔ آپ کا از حد مشکور ہوں کہ مجھ ناچیز کو اپنے بیش بہا خیالات سے اس طرح مستفید فرماتے ہیں اور خود کو سخت ملامت کرتا ہوں کہ کچھ لکھتا ہی نہیں مگر مجبوری ہے تقصیر نہیں۔ کام سخت ہے۔

مارشل محمود شفقت پاشا کی موت نے (جو قتل کئے گئے تھے) ترکی پر غضب الٰہی کی حجت کو تمام کردیا۔

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام وسبو میخانہ خالی ہے (غالبؔ)

عبدالرحمٰن

(۱۹)

مراد آباد،

۱۷ جنوری ۱۹۱۶ء

رفیق شفیق وحبیب صدیق

تسلیم و نیاز۔ آپ کا محبت نامہ شرف صدور فرما ہوا۔ افسوس کہ جواب میں تاخیر ہوئی۔ اس تقصیر کا باعث محض علالت ہوئی۔ بارے اب بخار کھانسی سے فراغ پایا ہے۔

آپ نے جو مضمون کے متعلق تحریر فرمایا۔ چونکہ زیادہ تعریف محض

آپ کی محبت پر مبنی ہے آپ کی دوست نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چند سطحی عیوب کو ظاہر فرما کر اصلی عیوب پر پردہ ڈال دیا۔ آپ نے میری التجا 'آفریں برنظر پاک خطا پوشاں باد' پر عمل فرمایا۔ مضمون میں سوائے اس کے کہ وقت کی چیز ہے اور کچھ نہیں۔ تنقید وغیرہ کی نسبت عرض ہے۔

کچھ کذب وافترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا (حالؔی)

آپ کی تنظیر سے مجھے اتفاق ہے۔ البتہ یہ خیال آپ کا درست نہیں کہ میں نے خواہ مخواہ حُسنِ ظن کو کام میں لا کر اقبال کے ہاتھ میں جامِ شیراز اور جامِ دہلی دے دیا ہے۔ وہ شراب جو اقبال کی مینا میں ہے ''پچ آب''، نہیں بلکہ آبِ حیات ہے۔ شاید آپ اب بھی یہی فرمائیں 'کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے'۔ آپ کے بقیہ قطعات کا منتظر ہوں۔ خدا کے لئے جلد لکھ کر بھیجئے واقعی ایک لاجواب چیز ہوگی۔ سبحان اللہ کیا کلام ہے!!!

ع۔ چہرہ اشک گرم پر شبنمی ایک نقاب ہے۔

اس زمانہ میں سرودِ حقیقی آپ کے بربط کے تاروں سے نکلنے کے لئے بے تاب ہے۔ کہیں ساز محض غفلت اور سُستی سے تشنۂ مضراب نہ

ہو جائے۔ دنیا کا نقصان نہ کیجئے۔

میں ایک مضمون بحیثیت تقریظ کلام غالبؔ پر لکھنا چاہتا ہوں لیکن قلم یارا نہیں دیتا۔ ناکام کوشش کر کے رہ جاتا ہوں۔ اللہ اکبر۔ کیا بارگاہ ہے جہاں قرب سے پر جلتے ہیں۔

عرصہ سے کچھ نہیں ملا۔ اگر یہی لیل ونہار ہیں تو رفتہ رفتہ رنگ سے تمام صیقل بلکہ ملمع اُتر جائے گا۔ جس چیز کی بنیاد ملمع پر مبنی ہو کیا افسوس ناک وجود ہے۔

اپنے جملہ حالات سے اطلاع دیجئے۔ مضمون آپ کا ''تمدن'' میں کب شائع ہوگا۔ ایک مضمون ''مذہب اور علم'' کے عنوان سے میں نے لکھنؤ کے رسالہ ''معلومات'' میں چھپوایا تھا۔ اول تو مضمون ہی خشک۔ دوم چھپا غلط ہے۔ الحمد للہ کہ میرے پاس بھی نہیں۔ اس کی اطلاع اس وجہ سے دیتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ آپ کی نظر پڑ جائے تو میں بری الذمہ خیال کیا جاؤں اور معذور دیکھا جاؤں۔ گویا وہ میری تحریر نہیں ہے۔

آپ سے ملنے کو بے انتہا جی چاہتا ہے۔ دیکھئے فروری میں انشاء اللہ حاضر ہونے کی کوشش کروں گا اور اہل دہلی کی بھی خیریت لکھئے گا۔ ہمیشہ سلامتی مزاج کا جویاں اور طالب ہوں۔

زیادہ سلام و نیاز

عبدالرحمٰن

(۲۰)

بنام مولوی عبدالحق

بھوپال،

۱۵ اکتوبر ۱۶ء

محترم و معظم تسلیم بہ صد تعظیم

مولانا ہاشمی صاحب سے یہاں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے آپ کے دفعتاً حیدرآباد بلائے جانے کے متعلق مکرر زبانی فرمایا۔ نہایت افسوس ہے کہ آپ سے ملاقات کا یہ قریب ترین اور عمدہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ آئندہ ماہ نومبر کے آغاز سے میں بھی تین ماہ کے دورہ پر جاؤں گا۔ لیکن امید ہے کہ زمانۂ کرسمس میں علیگڑھ یا لکھنو جہاں آپ کا ارشاد ہوگا ضرور حاضر ہو سکوں گا۔

آپ نے باوجود میرے استفسار کے کہ انجمنِ ترقی اردو کا اجلاس کہاں ہوگا تفصیلات سے کوئی بھی اطلاع نہیں بخشی۔ اخباروں میں چرچا ہے اور آپ خاموش ہیں۔ جو مضمون میں نے انجمنِ ترقی اردو کے متعلق لکھ کر

گذشتہ سال آپ کی خدمت میں بمبئی روانہ کیا تھا اس کے متعلق ایک مہربان کا یہ خیال ہے کہ اگر انجمن کا اجلاس لکھنؤ میں ہو تو اُس کو وہاں پڑھوں۔ اگر آپ کی رائے میں یہ مناسب ہو تو میں تیار ہوں۔ لیکن اِس مضمون کا آخری اور مکمل مسودہ آپ ہی کے پاس ہے۔ میرے پاس چند پراگندہ اجزاء پڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ موجود ہو اور آپ میرے پاس روانہ فرما دیں تو میں اس کو دوبارہ دیکھ لوں گا۔ اور اگر آپ کا مشورہ ہوگا تو اس عرصے میں اس کو چھپوا بھی لوں گا۔ یہ میں قطعاً آپ کے مشورہ پر چھوڑتا ہوں۔

مولانا ہاشمی صاحب کی گفتگو سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ شائد آپ کا ارادہ ہے کہ دیوانِ غالب کو لکھنؤ النا ظر پریس میں ہی طبع کرا لیا جائے۔ گو مجھ کو اس بات کا باور نہیں ہوتا لیکن اِس خبر نے مجھ کو نہایت مُشوش کر دیا ہے اور میں نہایت مضطربانہ التجا کرتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہ فرمائیے گا ورنہ تمام محنت برباد ہو جائے گی۔ جو دیوان لکھنؤ میں کتابت ہوا ہے نہایت عمدہ ہے لیکن اگر اس کی چھپائی کے لئے کسی نہایت اعلیٰ درجہ کے گلوں کے پریس میں انتظام نہ کیا گیا تو کتنا ہی عمدہ کاغذ لگایا جائے حروف پھیل جائیں گے، سطریں غیر متوازی ہو جائیں گی اور تمام صورت اور نقشہ بگڑ جائے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ اول تو لکھنؤ کے خوش نویس کے لکھے ہوئے

مسودہ (کاپی) کو فوٹو کرانے کی کوشش کی جائے۔ یو۔اے، کلکتہ کا کارخانہ دنیا کے عمدہ کارخانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں صرف ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ لاگت بہت ہی بڑھ جائے گی۔ بہر حال ایک اندازہ طلب کرنے میں مضائقہ نہیں۔

اِس کے بعد ایک پریس بمبئی میں ایک شخص حیؔ نامی نے کھولا ہے جو لیتھو میں بہترین بتلایا جاتا ہے۔ حیؔ نے لیتھو کا فن یورپ میں تحصیل کیا ہے اس کا پتہ لگا کر اس سے طبع کرالیا جائے۔ جو دیوانِ غالبؔ آپ طبع کرار ہے ہیں وہ ایک کتاب کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہاشمی صاحب کا خیال غلط ہے اور میں خوانخواہ یہ لکھ رہا ہوں لیکن دل نے نہ مانا اور جب تک لکھ نہ دیا دل کا وسوسہ نہ دبا۔

عبدالرحمٰن صاحب دہلی میں ہیں۔ حکیم اجمل خاں صاحب کو کوچ کرنے یا میل سمجھانے (یہ دونوں ان کے اپنے الفاظ ہیں) گئے ہیں۔ ۱۸ کو پرنس حمیداللہ خاں، حکیم اجمل خاں، مفتی انوارالحق کی لفٹینٹ گورنر سے آگرہ میں ملاقات ہے۔ دیکھنا ہے کہ ڈیرہ دون کالج کی قسمت کا کیا تصفیہ ہوتا ہے۔ آپ کے طویل والا نامہ کا جواب عرض کرنے کی ابھی نوبت نہیں آئی۔ انشاء اللہ فرصت سے لکھوں گا اور اپنا حال کیا لکھوں،

جملہ کوائف بدستور ہیں۔ والسلام

عبدالرحمٰن

(۲۱)

بنام مولوی عبدالحق

بھوپال،

۲۷ جولائی ۱۷ء

معظم و مہربانم تسلیم بہ صد تعظیم

(۱) مرزا سعید صاحب کے معاملے کے متعلق ہنوز جواب نہیں آیا۔ براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ کیا ہوا۔ کیونکہ اگر اردو یونیورسٹی ان کو نہ لے تو مسلم یونیورسٹی اُن کو مجبور کر کے اُن کی خوشامد کر کے اُن کو ولایت روانہ کرے۔

(۲) دیوانِ غالبؔ کی کاپیاں پہنچ گئیں۔ ایک نمونہ تیار ہو رہا ہے جب تیار ہو جائے گا روانہ ہوگا۔ علاوہ اس کے زنک پلیٹ فوٹو ٹائپ کرنے کے متعلق خط و کتابت کر رہا ہوں، کلکتہ کی ایک کمپنی تیار ہے۔ اوروں کے جواب ابھی نہیں آئے۔ تخمینوں سے اطلاع دوں گا۔ اگر آپ پانچ ہزار تک صرف کرنے کو تیار ہوں تو ضرور بہترین فوٹو زنک پلیٹ ٹائپ بہترین جلد کے ساتھ بہترین کاغذ سمیت ممکن ہے۔

(۳) کاپی ممکن ہے کہ اور لکھوانی پڑے۔ فوٹو ٹائپ کے لئے یہ موزوں نہیں۔

(۴) چند تصاویر متعلق مضامین (دیوان) کا بھی بندوبست کر رہا ہوں، دہلی سے قبر کی تصویر بھی منگوائی ہے۔

(۵) سید نذیر ہاشمی صاحب سے ملاقات ہوئی اور خیریت اور سلامتیِ مزاج دریافت ہوکر خوشی ہوئی۔

(٦) میں نے ایک برگساں کے لکچر کا جو 'خواب' (رویا) کے متعلق ہے ترجمہ کیا ہے، حکم ہو تو حاضر کیا جائے۔

(۷) King of the Dark Chamber کے ترجمے کے لئے مجھ کو یاددہانی کیجئے تاکہ مفتی صاحب سے مکمل کرا کے۔۔۔۔

(۸) ایک خط آپ کی خدمت میں۔۔۔صاحب کا روانہ کرتا ہوں یہ واقعی نہایت قابل شخص ہیں۔ یہاں بیچارے سائر اور محکمے میں پچاس ساٹھ کے ملازم ہیں، چوں کہ علمی مذاق کے آدمی ہیں سخت مجبوری میں خود کو پاتے ہیں۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے

اگر اردو یونیورسٹی ان کو تراجم کے لئے لے لے تو موزوں شخص ہیں۔

انگریزی بھی جانتے ہیں چنانچہ ٹیگور کی کتاب گیتان جلی کا ترجمہ کیا ہے۔
ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ کے مستحق ہیں۔

میں خود ان ہی کے الفاظ میں ان کی آپ سے سفارش کرتا ہوں:
''اگر آپ کی کوشش سے ایک شخص کی زندگی سدھر جائے تو کیا حرج ہے''۔

زیادہ سلام و نیاز

عبدالرحمٰن

(۲۲)

بنام مولوی عبدالحق

بھوپال،
۲۷ فروری ۱۸ء

جنابِ والا۔ تسلیم

مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں آنکھوں کی شکایت کے باعث آپ کے مراسلہ سر رشتہ نظامت تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن نمبری ۱۰۱ کا اب تک جواب تحریر نہ کر سکا۔ اب بھی میں تحریر کے کام سے بہت کچھ معذور ہوں لیکن چونکہ تعمیلِ ارشاد ضروری ہے چند سطریں لکھوا کر ارسالِ خدمت کرتا ہوں۔

آپ کے مراسلہ مذکورہ بالا کے اور مجوزہ نصابِ اردو یونیورسٹی کے مطالعہ سے کم از کم مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی جس کا دوسرا نام اردو یونیورسٹی ہے حقیقت میں اردو یونیورسٹی نہیں ہے بلکہ عربی یونیورسٹی ہے۔

آپ کے نصابِ تعلیم میں اردو زبان کو سوائے ذریعۂ تعلیم قرار دینے کے کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے، جو درجہ کہ اردو کا ہونا چاہئے تھا وہ انگریزی کو دیا گیا ہے۔ زبانِ اردو کا مطالعہ بالکل اختیاری رکھا گیا ہے اور اس کو زیادہ سے زیادہ تلگو، تامل، کناری زبانوں کی حیثیت دی گئی ہے۔

شعبۂ دینیات میں عالم اور فاضل وغیرہ کے امتحانات میں اردو کا کہیں نام ونشان بھی نہیں پایا جاتا، کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ علمِ حدیث، فقہ اور اصول کی تعلیم اردو میں نہیں دی جا سکتی۔

اس وقت تمام دنیا میں یہ کوشش ہے کہ ملکی زبان کو فروغ دیا جائے۔ دولتِ عثمانیہ میں جہاں کوئی خاص ترکی زبان کی یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی ہے گذشتہ دس برس کے اندر زبان کی 'قلبِ ماہیت' ہو گئی ہے اور عثمانلی ترکی ایک خالص چغتا یا تورانی زبان ہو گئی ہے۔ لیکن آپ باوجود ایک اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا دعویٰ کرنے کے اپنی پرانی روش کو چھوڑنے پر آمادہ

نہیں معلوم ہوتے۔

میری ناچیز رائے میں جب تک آپ اردو کو نہ صرف دنیوی علوم بلکہ دینی علوم کا ذریعۂ تعلیم قرار نہ دیں گے اور اردو علم و ادب اور زبان کے مطالعہ کو بحیثیت ایک مستقل مضمون کے ہر جماعت میں لازم قرار نہ دیں گے اردو یونیورسٹی اس ملک میں وہ کام نہ کر سکے گی جس کی اس سے امید ہے۔ اردو زبان کو صرف موجودہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے ہی نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس سے بھی نقصان پہنچا ہے کہ اردو کو عربی فارسی کے مقابلہ میں غیر ضروری اور کم وقعت خیال کیا گیا ہے۔ دیوبند اور ندوۃ العلماء اور تمام عربی اور فارسی مدارس پر اگر یہ الزام نہیں ہے تو کیا ہے کہ آج تک علمِ تفسیر علمِ حدیث، علم الاصول، منطق، فلسفہ اور ادب کی ضروری سے ضروری کتابیں بھی اردو میں ترجمہ نہیں ہوئیں۔ اگر اردو یونیورسٹی بھی ان امور کی طرف سے ایسی ہی غافل رہے گی تو آخر اس کام کو کون کرے گا۔

اس وقت انگریزی کی تعلیمی پالیسی کا جو رخ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید گورنمنٹ بھی اپنے مختلف صوبہ جات میں مقامی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہتی ہے اگر ایسا ہوا تو آپ کی اردو یونیورسٹی اور گورنمنٹ کی یونیورسٹیوں میں شاید ہی کوئی فرق رہ جائے جس کی بنا پر آپ اپنا امتیاز

ظاہر کرسکیں۔ میں عربی اور فارسی کی تعلیم کا مخالف نہیں ہوں۔ عربی علومِ اسلامیہ کا مخزن ہے اور فارسی ہماری تہذیب اور تمدن کا ایک جزو ہے لیکن عربی اور فارسی کی تعلیم و اشاعت کے لئے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام میں چین سے لے کر مراکش تک اور ہندوستان سے لے کر روس تک بہت سی درسگاہیں موجود ہیں۔ خدانخواستہ ان زبانوں کو اپنی ترقی اور فروغ کے لئے اردو یونیورسٹی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اردو زبان کی موت اور زیست اردو یونیورسٹی کی کامیابی اور ناکامیابی پر منحصر ہے۔

اردو یونیورسٹی کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے طالبعلموں میں اتنی لیاقت پیدا کر دے کہ ان کو اردو سے شُد بُد ہو جائے بلکہ اس کا کام آئیندہ اردو علم وادب کی شاندار عمارت تیار کرنا ہے۔ اردو یونیورسٹی جس غلطی میں مبتلا معلوم ہوتی ہے انگلستان کی یونیورسٹیاں عرصہ تک اس غلطی میں مبتلا رہی ہیں اور ان کے بہت برے نتائج برداشت کر چکی ہیں۔ انگلستان میں بھی آکسفورڈ، کیمبرج اور دیگر یونیورسٹیوں کا یہ خیال تھا کہ یونانی اور لاطینی زبانوں کا تحصیل کرنا انگریزی سے زیادہ ضروری ہے۔ لیکن بالآخر زمانہ نے ان کو ان کی غلطی پر متنبہ کر دیا۔

بعض لوگ یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ اردو زبان میں قابلِ تحصیل

بات ہی کیا ہے؟ اردو نہ صرف موجودہ ایشیائی زندہ زبانوں میں پیش پیش ہے بلکہ ایک بلند پایہ زبان ہے۔ اردو زبان کی تاریخ پر اگر غور کیا جائے تو اردو کا نہ صرف ایرانی بلکہ تورانی زبانوں سے بھی تعلق ہے۔ اردو کو نہ صرف مشرقی زبانوں ہی سے بلکہ جدید مغربی زبانوں سے بھی ربط ہے۔ اردو زبان کی تاریخ کا مطالعہ اور اردو علم اللسان کی تحقیق اتنا بڑا کام ہے کہ اگر عثمانیہ اردو یونیورسٹی چاہے تو اپنا کل وقت ان ہی دو امور پر صرف کر سکتی ہے۔

اس وقت دنیا میں وہ زمانہ ہے کہ جب تک کوئی یونیورسٹی کوئی خاص کام اپنے ذمہ نہ لے اور علومِ متداولہ میں کوئی خاص اضافہ نہ کرے علمی اعتبار سے اس کا عدم اور وجود زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اگر عثمانیہ اردو یونیورسٹی دنیا میں اپنی کوئی حیثیت قائم کرنا چاہتی ہے تو اس کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف اردو کی خدمت، اشاعت اور تعلیم کو اپنا نصب العین قرار دے۔

گذشتہ دسمبر میں جب کلکتہ میں ہمارے ملک کے سر برآوردہ حضرات جمع تھے علاوہ اور مسائل کے زبان کے مسئلہ پر بھی بحث ہوئی تھی اور کم وبیش یہ قرار پایا تھا کہ اردو یا ہندی یا ہندوستانی ہمارے تمام ملک کی متحدہ زبان قرار دی جائے۔ یہ فیصلہ گو ابھی زیادہ اہمیت نہ رکھتا ہو تا ہم بتلا رہا

ہے کہ اردو زبان کو بہت جلد کیا حیثیت ملنے والی ہے اور اردو یونیورسٹی کو اُس وقت کے لئے ابھی سے تیار رہنے کی کس قدر ضرورت ہے۔

اردو زبان کا مسئلہ جہاں اور مختلف حیثیتیں رکھتا ہے ایک حیثیت یہ بھی رکھتا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کا باہمی اتفاق بھی اس پر مبنی ہے۔ ہمارے ملک میں ایک افسوسناک تحریک یہ پیدا ہو چلی ہے کہ مسلمان اردو میں ہندی الفاظ کی تعداد کم اور عربی اور مشکل فارسی کے الفاظ کی تعداد کو زیادہ کرتے جاتے ہیں اور ہندو ہندی سے سہل اور رائج عربی اور فارسی الفاظ کو خارج اور غیر مانوس اور ادق سنسکرت الفاظ کو ان کی جگہ داخل کرتے جاتے ہیں۔ اگر یہ افراط و تفریط یوں ہی جاری رہی تو اردو اور ہندی سچ مچ دو جدا اور مختلف زبانیں بن جائیں گی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی اس غلطی سے متنبہ ہونا واجب ہے کیونکہ دونوں کی یہ نادان دوستی زبان اور ملک دونوں کے حق میں عین دشمنی ہے۔ اصطلاحاتِ علمیہ کی تلاش اور انتخاب کے وقت سب سے زیادہ اس کا خیال ضروری ہے۔

اصطلاحاتِ علمیہ کے وضع کرنے میں بھی اردو یونیورسٹی کو بے جا تقلید سے بچنا ضروری ہے۔ ترکوں نے انگریزوں کی طرح بہت سی اصطلاحات کو (مثلاً آکسیجن، ہائیڈروجن وغیرہ) ویسا کا ویسا ہی اپنی زبان

میں لے لیا ہے۔ یہ محض ان کی پست ہمتی اور نارسی کی دلیل ہے۔ جرمنوں نے جو علمی حیثیت سے انگریزوں کے مقابلہ میں ایک نئی قوم ہے ایسا نہیں کیا بلکہ سب اصطلاحات کو اپنی زبان میں وضع کر لیا ہے۔ اردو یونیورسٹی کو اس بارہ میں جرمنوں کی تقلید کرنی چاہئے۔

لیکن اردو کے لئے جس طرح انگریزی یا لاطینی اصطلاحات کا اختیار کرنا غلط ہے عربی اصطلاحات کا اختیار کرنا بھی درست نہیں۔ عربی اصطلاحات کے اختیار کرنے میں یہ فائدہ ضرور ہے کہ بیروت اور مصر میں جو کام ہوا ہے اس سے اردو یونیورسٹی فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ لیکن اردو یونیورسٹی کے پاس ماشاءاللہ چالیس لاکھ روپیہ کا سرمایہ موجود ہے اور اعلیٰ حضرت حضور نظام کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے۔ اردو یونیورسٹی کو کس بات کی کمی ہے کہ وہ یوں دوسروں کی دست نگر ہو۔

عربی اصطلاحات کے اختیار کرنے سے وہی قباحت جو انگریزوں کو لاطینی اصطلاحات کی وجہ سے ہے، باقی رہتی ہے اور وہ آسانی جو جرمنوں کو اپنی اصطلاحات سے ہے، پیدا نہیں ہوتی۔ اصطلاحات علمیہ کی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص ان کو بہ آسانی سمجھ لے۔ اگر اردو یونیورسٹی ایسی اصطلاحات وضع کرے گی جن کا مفہوم پانے کے لئے اول عربی زبان کا سیکھنا لازمی ہوگا

تو اردو یونیورسٹی کا کام کسی طرح ہماری زبان اور ہمارے ملک کے لئے مفید ثابت نہ ہوگا۔

انجمنِ ترقی اردو نے ایک کتاب حیوانات کے متعلق شائع کی ہے اس میں قابل مصنف نے مفصلۂ ذیل اصطلاحات کا استعمال کیا ہے:

کثیرۃ الرجل یا نحوطیہ، شوکتہ الجلد، مستعلج الجلد، سُلحفیہ، مستقیمتہ الاجنحہ۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ کون شخص ایسا ہے جو عربی زبان جانے بغیر ان الفاظ کے معنی سمجھ سکتا ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ انگریزی اصطلاحات ہی اختیار کر لی جاتیں۔ گوایسا کہنا فخر کا باعث نہیں لیکن ہمارے ملک کے لوگ انگریزی الفاظ سے کم از کم ان الفاظ کی نسبت زیادہ واقف ہیں۔ اگر ان ہی تمام اصطلاحات کا ترجمہ کثیر پا، خار پشت، گداز جلد، غلاف پوش اور راست پَر کیا جاتا تو کیا حرج تھا۔ ہر شخص ان الفاظ کے معنی سمجھتا ہے پس اردو یونیورسٹی کو ایسی اصطلاحات وضع کرنی چاہئیں جو درجۂ قبول کو پہنچ سکیں۔

مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں اصطلاحات کی مرسلہ فہرست کے متعلق رائے لکھنے سے اس وقت معذور ہوں۔ عبدالرحمٰن

ایجوکیشنل ایڈوائزر، بھوپال اسٹیٹ،

☆☆☆☆☆☆☆

منظومات

نظم جو سر سید علیہ الرحمۃ کے مزارِ پاک پر پڑھی گئی

بزمانہ اسٹرائک از ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم

(عہد نواب محسن الملک مرحوم ۱۹۰۷ء)

اُس بڑی سرکار کے قابل مری فریاد ہے
چل حضوری میں شہِ یثرب کی تو لے کر مجھے

میرا کیا منہ ہے کہ اس سرکار میں جاؤں مگر
تیرا جیسا مل گیا تقدیر سے رہبر مجھے

واسطہ دونگا اگر لختِ دلِ زہراؑ کا میں
غم میں کیونکر چھوڑدیں گے شافعِ محشرؐ مجھے

رونے والا ہوں شہیدِ کربلا کے غم میں میں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیِ کوثر مجھے

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہلِ بیت
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظِلّ دامنِ حیدرؓ مجھے

آہ تیرے سامنے آنے کے ناقابل ہوں میں
منہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں

صبحِ بنارس

(جوگی کی صدا)

یہ ستھری ستھری آنکھیں   یہ لمبی لمبی پلکیں
یہ تیکھی تیکھی چتون   یہ سندر سندر درشن

مایا ہے سب مایا ہے

یہ گورے گورے گال   یہ کالے کالے بال
یہ پیاری پیاری گردن   یہ ابھرا ابھرا جوبن

مایا ہے سب مایا ہے

گل جھوٹا ہے سنسار   اک سچا ہے سرجن ہار

بچّے اور بڑے

(اندلسی گیت)

بچے

دیکھا گیا ہے   گودی میں سوتے
سپنے میں بچّے   ہیں سارے ہنستے

دیکھا گیا ہے   گودی سے سوتے
اٹھنے پہ بچے   ہیں سارے روتے

بڑے

دنیا کے نقشے   ہیں خواب سارے
دھوکے میں جن کے   ہیں سارے ہنستے
لیکن جب اٹھتے   خوابِ گراں سے
بچے ہوں جیسے   ہیں سارے روتے

اجنبی

صنم فرنگ، قمر جبیں، بت سیم رنگ، غضب حسیں
وہ عذار نازک و شرگیں کہ رقیبِ ساغرِ آتشیں
وہ ہوا میں کاکلِ عصفریں چوں شہابِ ثاقب شب رواں
ورقاتِ غنچہ گلاب گوں، دو لب گداز پُر از فسوں
مژہ دراز کج رنگوں میں نہاں دو دیدۂ نیلگوں
کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبدِ آسماں
تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا

ترے عشق میں ہوں میں مبتلا، بسلاسل الم و بلا
مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں، تجھے کیا خبر گئی کس کی جاں
(بحر سفید جہاز شہر کلکتہ سنہ ۱۹۱۴ع)

معلم الملکوت

تھا عدم میں نقش ہستی جبکہ بے نام و وجود
قدرت خالق نے پائی تھی نہ خلقت میں نمود
سب سے پہلے لفظ کن بن کر قضا ظاہر ہوا
حلقہ پُر کاری کو جس کے، وقت راہ پیا ہوا
وسعتِ عالم نے پائی صورت بحر اثیر
قوت و طاقت تھیں یکجا جسکی موجوں میں اسیر
کشمکش نے دونوں کی، آمادہ اک طوفاں کیا
الفت و نفرت نے برپا سخت اک ہیجاں کیا
ارتعاشِ عشق نے پیدا کیا وہ سوزِ دل
ہوگیا جس کے اثر سے آب دریا مشتعل
سینۂ دریا سے باہر نکلا اک روشن سحاب
درفشارِ خود گرفتہ گرمئی صد آفتاب

تھا یہ پاشیدہ برویم آتشِ افروختہ
کائناتِ آفریدہ جس کی تھی اندوختہ
قرنہا تک جب یہ آتش خانہ یوں جلتا رہا
جوں سمندر اس کے انگاروں سے میں پیدا ہوا
میں سراپا شعلہ تھا اور وہ سراپا نور تھا
میں کجا اور وہ کجا، لیکن نہ اُس سے دور تھا
حسن جب اظہار جو، جلوہ کناں کوئی نہ تھا
بہرروئے یار اس دم، میں ہی تو آئینہ تھا
سب سے پہلے معرفت سے میں نے ہی جانا اُسے
سب سے پہلے میں نے ہی عالم میں پہچانا اُسے
عمرہا یوں شعلہ افشاں رہ کے یہ نارِ عظیم
بجھ گئی، پسماندہ باقی رہ گئی خاکِ لئیم
وائے قسمت! تھا نہ میں واقف یہ ہے خاکِ رقیب
کاش اُس دم مجھ کو ہوتا علم، اے میرے نصیب
عرش کا پایہ پکڑ کر روتا، کہتا ''اے خدا!''
خالقِ کون و مکاں! فریاد ہے، عالم پناہ!

کرنہ پیدا اس کوروئے ارض پر، یہ بدنہاد
ڈالے گا عصیاں سے اپنے، کُل خدائی میں فساد
تھا یونہی امرِ قضا، ہونا جو تھا وہ ہی ہوا
امرِ حق صادر ہوا، فرمانِ حق پورا ہوا
کُل فرشتوں نے گِلِ مردود کی تخمیر کی
اور آب و گِل سے اس کی صورت اک تعمیر کی
قلبِ ماہیت سے عاری کالبدِ عریاں سفید
بے پروشہبال، چشم و سر سیہ، دنداں سفید
وارثِ تختِ خلافت، رونقِ باغِ جناں
ہے یہ آدم، سب کرو سجدہ اسے، ''خورد وکلاں''
حکمِ باری پر ملائک نے اسے سجدہ کیا
سب خمیدہ ہوگئے، اک میں ہی باقی رہ گیا
''اسکو سجدہ کرنے میں کیا کچھ تجھے انکار ہے؟''
''ہاں مجھے انکار ہے، انکار ہے، بس عار ہے''
''عار ہے؟ کہتا ہے کیا' ڈر، تجھ پہ ہے قہرِ خدا
عار ہے تجھ کو، ملائک تک نے جب سجدہ کیا''

''ان کی حالت اَور ہے، میری حالت اَور ہے
رسمِ طاعت اَور ہے، رسمِ محبت اَور ہے
حکم ربی ہے کہ میں سجدہ کروں، لیکن نہیں،
غیر کو سجدہ کروں؟ مجھ سے تو یہ ممکن نہیں''

یادِ گُل

وہ گالوں پہ زردی کہ جوں زعفراں
پڑی تھیں جہاں اور تہاں پتّیاں
اُڑی ایک اتنے میں سوئے نہال
دیا اپنی باہوں کو گردن میں ڈال
وہ پتی نہ تھی بلکہ تھی تیتری
تصور میں تھی گُل کا منہ چومتی

ہندوستان

فوق البشر نشستہ ہے اک ہستیِ عظیم (گذشتہ ہندوستان)
مصروفِ غور، کف پہ زنخداں لئے ہوئے
پہلو میں اس کے اک زنِ گلگوں گداز تن (موجودہ ہندوستان)
آبِ حیات سینۂ عریاں لئے ہوئے

مشغولِ نوش چشمۂ آبِ بقا پہ ہے (آئندہ ہندوستان)
طفلک دہن میں غنچہ پستاں لئے ہوئے

دعا

جامن کے سائے کے تلے جوئے رواں اور نیم ناں
شامل ہوں جسمیں سب مرے بچے اور انکی نیک ماں
پیغمبری ہو یا شہی، یا ہو حیاتِ جاوداں
مجھ کو دیجو بس یہی آب زلال اور نیم ناں

گیتان جلی

پہلے بند کا منظوم ترجمہ

خوشی تیری اسی میں ہے بنا اک جامِ گل مجھ کو
بھرے خالی کرے ہردم زلالِ زندگانی سے
پھرا اِس نے کو تو لے کر ہر اک کہسار و وادی میں
اسی میں کی ہے دم تو نے ہمیشہ تازہ موسیقی
مبارک ہاتھ لافانی ترے چھوتے ہیں دل میرا
خوشی سے ہو کے بے قابو، میں کیا تقریر کرتا ہوں

کرم تیرا ہے بے پایاں مرا کو تاہ پیمانہ
بھرے خالی کرے ہردم ہنوز اس میں ہے جا باقی

دوسرے بند کا ترجمہ

جب تو دیتا حکم ہے مجھ کو کہ ہو نغمہ سرا
فخر سے دل میرا سینے میں سما سکتا نہیں

تیسرے بند کا ترجمہ

سرود تیرا کرے ہے روشن تمام عالم کو اے مغنی
ہے روحِ نغمہ رواں فلک پر مثالِ تارِ حیات دائم
رواں ہے، گو سنگ ہوں مزاحم ترے ترانے کا پاک دریا
ہے کیسی دل میں مرے تمنا شریک تیرے سرود میں ہوں

چھٹے بند کا ترجمہ

اس ذرا سے پھول کو بہرِ قبول
شاخ سے چُن لینے میں مت دیر کر
ورنہ مجھ کو خوف ہے اے گلعذار
خشک ہو، یہ خاک میں مل جائے گا

گو پریدہ رنگ ہے اور بُو نحیف
رحم کر اور توڑ لے قبل ازغروب
وقت باقی ہے عبادت کا ہنوز
بُت کدے میں کردے دیوی پر نثار

ساتویں بند کا ترجمہ

مرے نغمہ کی آرائش نہیں جز عین عریانی
لباس اور ظاہری زینت سے تن اس کا مبرا ہے
نہیں شبنم صفت اک پیرہن تک وصل میں حائل
نہ زیور جو تری سرگوشیوں میں غل سے حارج ہو

نویں بند کا ترجمہ

موت جس دم دے گی دستک تیرے دروازے پہ آ
کیا تو اضع اپنے مہماں کی بجالائے گا تو
مرحبا سلطانِ من حاضر ہے مینائے حیات
نوشِ عیش و نیشِ غم دونوں کا یہ آمیزہ ہے
عمر کا حاصل ہے میری بس یہی لبریز جام
نوش جاں حاضر جو ہے، بہرکرم فرمایئے

رنگ مانندِ یشب، بینی چو منقارِ عقاب
کہربا ریز نظر آنکھ میں اسود سحاب
نازک وچست بدن، تنگ درآغوشِ کتاں
جس طرح سے سینۂ عاشق پہ پھیلی ہوخمار
دیکھ کراس بتِ گلگوں کووطن بھول گیا
باندھ کرسر سے جونکلا تھاکفن بھول گیا

سترھویں بندکاترجمہ

میں بھی تری نگاہِ الفت کا منتظر ہوں
بس اس سبب سے مجھ کوتاخیر ہورہی ہے
ہرچند ہورہے ہیں، زیادہ گناہ لیکن
قانون اورشریعت سے دشمنی ہے مجھ کو
آئینِ دہر سے ہوں میں برسرِ بغاوت
جلّادومحتسب سے ڈرتا نہیں ہوں اصلا
جوچاہتے ہیں قائل، معقول مجھ کوکرنا
میں ایسے دوستوں کے سایہ سے بھاگتاہوں

میں تو تری نگاہِ الفت کا منتظر ہوں

بس اس سبب سے مجھ کو تاخیر ہو رہی ہے

موسیقی

جسمِ نغمہ مثالِ شیشہ ہے ‏ ‏ جانِ نغمہ شرابِ شعلہ ہے

رفعتِ خوباں عذارِ گل آویز ‏ ‏ ہستیِ روح جس سے ہے لبریز

وسعتِ آبِ جُو میں یخ بستہ ‏ ‏ اک پریشاں صبا کا گلدستہ

بلبلوں کے سرود میں عریاں ‏ ‏ خوابہائے شباب میں گریاں

ناہید (Venus)

حسن میں رشکِ ہر نگیں، رنگ عذار یاسمیں

شیشہ تنگِ نازنیں، مرمرِ بے مثال تھا

سنگِ خدا نے کی نگاہ، فکر نے جوں شعاعِ ماہ

خانۂ دل میں پائی راہ، جلوہ کناں خیال تھا

جیسے شکم میں طفل ہو، سنگ میں سو رہی تھی وہ

سن کے صدائے تیشہ کو خوابِ گراں محال تھا

روحِ تصور نہاں، جسم تھا صورتِ عیاں

حسن و حیاتِ جاوداں، اِن کا بہم وصال تھا

شمع و پروانہ

درحلقۂ موجِ صبا رقصاں ہوا چوں افشانِ گل

پروانہ سوئے بزم اپنی بیخودی میں تھا رواں

محفل میں تھے ہر چار سو مدہوش شیشے چل رہے

آتش بدن بے پیرہن اِک شمع ان کے درمیاں

سرتابہ پا ناہیدوش، اس کا درخشاں جسم تھا

آوارہ زلف عنبر فشاں ، بیتاب پیچیدہ دھواں

محفلِ طلسمِ روشنی ، پروانہ اک رنگیں غبار

مانندِ بوئے گل پریشاں در ہوائے بوستاں

بلّو رلب فانوس تھے سب خندہ زن اِس رقص پر

اِک شمع کی چشمِ حیات آسا سے تھے آنسو رواں

تھی دمِ زدن میں شمع، فانوس کے آغوش میں

آغوش میں تھا شمع کی پروانہ لیکن اب کہاں

ترکی قومی گیت

ہوں شاد ماں اہلِ وطن   حق سے ملی تازہ حیات

اس میں نہیں اصلاحِ سخن   لشکر نے دی ہم کو نجات

زنجیرِ قہر و ظلم کو بس ٹکڑے ٹکڑے کردیا
صد آفریں اے غازیو آزاد ملت کو کیا
لشکر کو ہو مظفری ہر معرکے میں اے خدا
داراز عمر بادشاہ داراز عمر بادشاہ

اے رایتِ عثمانیہ فتح و ظفر ہے تیرا کار
حبِ وطن میں ہر گھڑی صلح و اماں تیرا شعار
باہم برادر ہم ہیں سب اسلام کے ہم دلدادہ ہیں
راہِ وطن میں روز و شب جاں دینے کو آمادہ ہیں
لشکر کو ہو مظفری ہر معرکے میں اے خدا
داراز عمر بادشاہ داراز عمر بادشاہ

قانونِ فنا

آفرینش کیوں ہوئی عالم کا کیا ہے مقتضا
فلسفی کہتے ہیں تکوینِ ابد اور ارتقا
بعض کہتے ہیں کہ ہے قانون اس کا انقلاب
پر اصل میں ہے مسلط اس پہ قانونِ فنا

الحسن اور ڈارون اس سے کریں گو اختلاف
پر ہے قانونِ فنا ہستیٔ عالم کا مضاف
ہیں اندھیرے راستے ہو ارتقا یا انقلاب
لا ہی اک وہ راہ ہے جسکو کہہ سکتے ہیں صاف

جب کہ دی منصور نے پہلے انالحق کی صدا
سب نے اس کو قابلِ نفرین و دیوانہ کہا
دار پر لیکن دیا جب موت نے عقدے کو کھول
تب یہ جانا سب نے تھا منصور میں پنہاں خدا

ظاہرا انسان گو خالق سے اپنے دور ہے
نور ہے ذاتِ خدا یہ خاک میں مستور ہے
پر تمیز ما و تو رہتی نہیں بعدِ فنا
روحِ انسانی بھی مثلِ ذاتِ اکبر نور ہے

جب ہوا خالق کا انساں پر عتابِ اولیں
جنت الفردوس سے بھیجا گیا سوئے زمیں
زندگانی ہے سزا اور موت راہِ بازگشت
تا ازاں راہ بر مکانِ خویش باز آید مکیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب من۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ

نویدِ شادمانی آج یہ بادِ صبا لائی
نہالِ گلشن امید پر تازہ بہار آئی
سمومِ حزن سے پامال تھا گلشن امیدوں کا
نہ یارائے تحمل تھا نہ تھی تابِ شکیبائی
زبان و دل سے شکرِ حق تعالیٰ ہو نہیں سکتا
گلستانِ تمنا میں بہارِ جانفزا آئی
شبِ تاریک غم رخصت ہوئی مہر طرب چمکا
دلیل صبح عشرت ہے ہماری بزم آرائی
نہیں اوجِ فلک پر ضوفشاں یہ نیر اعظم
لئے ہے ساغر عیش و مسرت چرخ مینائی
زفیضش ہر نہال خشک روح تازہ می یابد
نسیم بہجت آگیں میکند کار مسیحائی
پیارے عبدالرحمٰن ڈاکٹر مرحوم کی دختر
دلہن بنتی ہے اے صد شکر یہ بھی سُبھ گھڑی آئی

مری آرایشِ محفل تمھارے دم قدم سے ہے
قدوم دوستاں پر منحصر ہے بزم آرائی
شود ہم دوش با اوج ثریا خانۂ احقر
زراہِ لطف گرائے صاحبِ من رنجہ فرمائی

تاریخ تشریف آوری	رخصتِ عروس
یوم شنبہ ۶ شوال المکرم ۱۳۴۸ھ ہجری مقدسہ:	یوم یکشنبہ ۷ شوال المکرم ۱۳۴۸ھ ہجری مقدسہ
مطابق ۸ مارچ ۱۹۳۰ء	مطابق ۹ مارچ ۱۹۳۰ء

المکلف

احقر الانام۔ نور الاسلام عفی عنہ۔ سیوہارہ۔ ضلع بجنور۔ یو۔ پی

☆☆☆☆☆☆☆

فرہنگ

الفاظ	معنی
اثاث البیت	اسبابِ خانہ داری، گھر کا سامان، منقولہ جائیداد
اثیر	بلند، آسمان، خالص، برگزیدہ، ایتھر۔
احلیل	مَرد کے پیشاب اور عورت کے دودھ کی نالی۔
اُخطِبُوطیہ	اکٹوپس۔ ایسا جانور جس کے بہت زیادہ پیر ہوں۔
اعیانِ نامشہود	اعیان جمع عین بمعنی آنکھیں، مشہود بمعنی موجود یا حاضر۔ دیکھئے ضمیمہ ''مثنویاتِ اقبال''۔
اغماض	چشم پوشی کرنا، درگذر کرنا۔
اقانیمِ ثلاثہ	تثلیث کے افراد۔
اکفاء	کفو کی جمع۔
الوان	لَون کی جمع بمعنی رنگ، قسم۔
امصار	مصر کی جمع معنی بہت سے شہر۔
اُمُومیّت	ماں ہونا۔ منصبِ مادری۔
انانیّت	خودپسندی۔ خودبینی۔

انتفاع	فائدہ اٹھانا، منافع، فائدہ۔
انجذابِ گدایانہ	انتہائی کمتری کے ساتھ شامل ہونا، بے حیثیت ہو جانا۔
بارِ علائق	بار معنی بوجھ اور علائق معنی بکھیڑے یعنی دنیاوی جھمیلے۔
بُغاز	آبنائے باسفورس۔
بہائم	بہیمہ کی جمع معنی چوپائے، مویشی، حیوان، ایسے لوگ جو حیوانی خصائل رکھتے ہوں۔
پژوہ	تلاش کرنے والا۔
تاخت	تباہی۔
تفاؤل	نیک فال لینا، شگون لینا، پُرامید ہونا، رجائیت
تفضیح	رسوائی، بدنامی، فضیحت۔
تنقیص	نقص نکالنا، اعتراض کرنا، گھٹانا، کم کرنا۔
جہانِ کون و فساد	کون و فساد معنی موجود ہونا اور تباہ ہو جانا مراد ہے فانی دنیا۔
جَسُور	بہادر، دلیر۔

چوپان	چرواہا۔
حَصر	احاطہ کرنا، گھیرنا، انحصار۔ حَصَر معنی رک جانا۔
حقیقت پژوہی	سچائی تلاش کرنا۔
حَیّزِ امکان	امکان کا کنارہ یعنی جہاں تک ممکن ہو سکے۔
خرقۂ سالوس	خرقہ معنی گدڑی اور سالوس بمعنی فریب یعنی مکرو فریب کا لباس۔
خَسَک	کانٹا۔
خِمار	چادر۔
دست پناہ	چمٹا۔
دستِ تعدّی	ظلم کرنے والا ہاتھ، ظلم کرنا، ظلم کرنے والا۔
دواوین	دیوان کی جمع۔
راحتِ لقوم	ایک مشروب۔
رایت	جھنڈا۔
ربقۂ شاگردی	طوقِ شاگردی۔
رَجعتِ قہقری	الٹے پاؤں واپسی، سابقہ حالت کی طرف لوٹنا۔
رَختِ خواب	سوتے وقت پہننے کا لباس۔

رویت	نظر آنا۔ دیدار۔ چہرہ۔
ریگِ امتنانی	امتنان معنی احسان رکھنا، نعمت دینا یعنی نعمتوں والا ریت۔
زُغال	کوئلہ۔
زلال	صاف میٹھا پانی، مقطر پانی۔
ساطور	چھرا، چھری، خنجر۔
ساھلا	ایک درخت۔
سب وشتم	لعن طعن کرنا۔ گالی گلوچ دینا
سُخرہ	جس کا مذاق اڑایا جائے۔ سُخرہ۔ مضحکہ اڑانے والا۔
سُرجن ہار	بنانے والا، پیدا کرنے والا، خالق۔
سُلَحفِیہ	ایسا جانور جس کی کھال غلاف کی مانند ہو جیسے کچھوا۔
سمیاطیقی	ایک زبان جس کی شاخیں عربی، عبرانی اور سریانی وغیرہ ہیں۔
سنجاق	جھنڈا، عَلَم۔

سوفتے	سوفتہ کی جمع بمعنی گھُن۔
شاذ	تنہا، اکیلا، کم۔
شوکۃ الجلد	ایسا جانور جس کی پشت پر کانٹے ہوں۔
صحیفۂ سامی	صحیفہ بمعنی رسالہ یا تحریر اور سامی بمعنی بلند، قابلِ عزت مطلب ہے قابلِ احترام مراسلہ۔
صعود	بلندی پر چڑھنا۔
عِذار	رخسار، گال، عارض۔
عُصفُریں	عُصفُر کسنبھ یا کُسم کا پھول یعنی کسم کی رنگت والا
عُمق	گہرائی۔
غدار	بہت بڑا، وسیع۔
فتادگی	تھکاوٹ۔ مایوسی۔
فرودگاہ	ٹھہرنے کا مقام، قیام گاہ۔
فوق السماء	آسمانوں کی بلندی اور وسعت مطلب آخری حد تک۔
قاب	تھال، بڑی رکابی، طباق۔
قعر	گہرائی۔

کالبُد	ڈھانچہ، سانچہ، قالب۔
کثیرۃُ الرِجل	ایسا جانور جس کے بہت سارے پیر ہوں۔
گوسفند	بھیڑ یا بکری۔
گھتیلا	ایک قسم کی جوتی جو ایڑی پر کھلی ہوتی ہے۔
لئیم	وہ کنجوس جو نہ خود کھائے نہ اوروں کو کھانے دے کمینہ، سفلہ۔
مامن	پناہ گاہ، جائے امن۔
مبارز	مقابلہ پر چڑھ کر لڑنے والا
مبحث	بحث۔ معاملہ۔ بحث یا تفتیش کا کام۔
مبداء	ابتدا۔ آغاز۔ شروع۔ اصل۔ بنیاد۔
متفاؤلی	فال نکالنا۔
مثالہ	شاہی فرمان
مرزبوم	جائے پیدائش، ملک کی حدود۔
مِرقات	زینہ، سیڑھی۔
مزعومات	مزعوم کی جمع معنی گمان کیا ہوا، زعم کیا ہوا۔
مُستعلجُ الجلد	ایسا جانور جس کی کھال نرم اور گداز ہو۔

مُستقیمۃُ الاجَنحہ	ایسا پرندہ جس کے پر سیدھے ہوں۔ راست پر
مشوّش	مضطرب۔ پریشان۔ حیران
مضاف	منسوب، متعلق۔
ملاءِ اعلیٰ	فرشتہ
مُغتَنَم	غنیمت سمجھا ہوا۔ مُغتَنِم غنیمت سمجھنے والا
منبع	پانی کا چشمہ۔ پانی کے نکلنے کی جگہ۔
منصۂ شہود	وہ جگہ جہاں کسی چیز کا جلوہ دکھایا جائے۔
مُہوّس	کیمیا گر، بہت ہوس رکھنے والا۔
ناھید	زہرہ۔ زہرہ کا مجسمہ۔ حسن وعشق کی دیوی
نقیض	ضد، الٹا، توڑنے والا۔
نوامیسِ الٰہیہ	نوامیس جمع ہے ناموس کی مطلب ہے احکاماتِ الٰہی۔
نہال	تازہ لگایا ہوا پودا۔
وہّاج	بہت چمکتا ہوا۔
یشب	سبز رنگ کا قیمتی پتھر
یشمک	ایک قسم کا باریک ریشمی کپڑا جس کو مصری اور

ترکی خواتین نقاب کے طور پر استعمال کرتی
ہیں۔

شخصیات

(نوٹ۔شخصیات کے ناموں کی فہرست اردو حروف تہجی کے مطابق دی گئی ہے)

اپالو (Apollo) یونانی اساطیر میں سورج کا دیوتا جو مردانہ حسن کی کامل تصویر سمجھا جاتا ہے۔

آرچر، ولیم۔

ابسن، ہنرک۔(Ibsen,Henrik) ۱۸۲۸ء سے ۱۹۰۶ء تک
ناروے کا ایک مشہور شاعر اور ڈرامہ نویس۔

اسپنسر، ایڈمنڈ۔(Spenser,Edmund) ۱۵۵۲ء سے ۱۵۹۹ء۔
ایک مشہور انگریزی شاعر۔The Faerie Queene کا مصنف۔شاعری میں ایک خاص طرز کا موجد۔

اسپی نوزا، بینیڈکٹ۔(Spinoza,Benedict de)

۱۶۳۲ء سے ۱۶۷۷ء۔ یہ ڈچ یہودی فلاسفر تھا مگر اصلاً پرتگال سے تعلق رکھتا تھا۔ نظریہ وحدت الوجود کا حامی تھا اور ڈے کارتے کے نظریات کا مخالف

الاب کارلوئیس۔(Father Carlouis) جس نے انگریزی اور عربی مترادفات کی لغت تیار کی۔

برکلے، جارج۔(Berkeley,George) ۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۳ء۔ آئرش بشپ اور ایک تصوراتی فلاسفر۔

برگساں، ہنری۔(Bergson, Henry) ۱۸۵۹ء تا ۱۹۴۱ء فرانسیسی فلاسفر۔

بروے، ولیم۔(Broome,William) ۱۶۸۹ء تا ۱۷۴۵ء اطالوی فلاسفر۔

بیکن، فرانسس۔(Bacon,Francis) ۱۵۶۱ء تا ۱۶۲۶ء انگریز فلاسفر جس نے سائنس میں استقرائی طریقہ متعارف کیا۔ وہ دو سال انگلستان کا لارڈ چانسلر بھی رہا۔

پالگ ناٹش۔(Polygnotus) ۵۰۰ ق۔م۔ تھریس کا ایک پینٹر۔ وہ اپنی یادگار دیواری پینٹنگز کے لئے مشہور ہے جو اس نے کلاسیکی طرز پر بنائی تھیں۔

پانڈکٹ۔(Digesta or Pandectae) رومن قانون کی کتاب۔

کیطینان غالباً یہ جسٹینین ہے۔ (Institute of Justinian

or Instututios) یہ بھی رومن قانون کی ایک کتاب ہے۔

دے کارت، رینے۔(Descartes,Rene') ۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء۔
فرانسیسی ریاضی داں، ماہرِ علم طبیعات، اور فلسفی۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ
کائنات خلا، مادّہ اور حرکت سے بنی ہے جو قوانینِ ریاضی کے تحت چل رہی
ہے۔

ڈایونیسی (Dionysus) یونانی دیو مالا میں عیش وطرب کا دیوتا جو
شاعری اور موسیقی کی ترغیب دیتا ہے۔

روسو، جین جیکوس۔(Rousseau, Jean Jaques)
۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء۔ فرانسیسی فلاسفر جو معاہدۂ عمرانی کا حامی تھا۔ اس کے
نظریات نے انقلاب فرانس پر بھی کافی اثر ڈالا۔

سیرو

شاروے

شلیگل، اوگسٹ ولہیلم (Schle'gel, August Wilhelm von)
۱۷۶۷ء تا ۱۸۴۵ء یہ دو جرمن رومانی ادب کے نقادوں کے نام ہیں۔

شیکسپیر کے ڈراموں کے مترجم۔

شیخ احمدؒ۔ حضرت شیخ احمدؒ رفائی۔ ولادت ۱۱۱۸ء، وفات ۱۱۸۲ء بہ مقام قریاتِ حسن ضلع بصرہ کا ایک گاؤں۔ طریقۂ رفاعیہ کے بانی۔

فدیت۔ (Phidias) ۴۹۰ تا ۴۳۰ ق۔م۔ ایتھنز کا مجسمہ ساز۔

فشتے، جان گوٹلِب۔ (Fichte, Johann Gottlieb) ۱۷۶۲ء تا ۱۸۱۴ء۔ ایک تخیلاتی جرمن فلاسفر۔ وہ اپنے 'خطاب بہ جرمن قوم' کی وجہ سے مشہور ہے جو اس نے ۱۸۰۸ء میں بمقام برلن کیا تھا جب روس نے پرشیا پر قبضہ کیا ہوا تھا۔

فلاطینوس (Plotinus(circa AD 205-69 مصری فلسفی جو افلاطونیتِ جدید کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

کامتے، اوگسٹے۔ (Comte, Auguste) ۱۷۹۸ء تا ۱۸۵۷ء ایک فرانسیسی فلاسفر۔ وہ اثباتی یا ایجابی طریقہ کا موجد تھا۔

کانت، ایمینول۔ (Kant, Immanuel) ۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء۔ وہ جرمن مابعد الطبیعاتی فلسفی تھا اور ماورائی فلسفہ کے مکتبِ فکر کا بانی تھا۔

کروچے، بینیڈٹو۔ (Croce,Benedetto) ۱۸۶۶ء تا ۱۹۲۵ء۔ ایک اطالوی فلسفی جو سیاست داں بھی تھا۔

گائس۔(Gaius) دوسری صدی قبل مسیح کا ایک رومن قانون داں جس نے 'Law of the Persons' تصنیف کیا۔

لسطیان

لوئیس معلوف۔(Louis Maaloof) جس نے بیروت سے عربی لغت 'المنجد' ۱۹۰۸ء میں بیروت سے شائع کی۔ اس کے ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ یعنی عربی الفاظ کا اردو ترجمہ۔ یہ لغت مستند سمجھی جاتی ہے۔

لیتھرج

مارسیلیس (Marsilius of Padua) فرانسیسی فلسفی اور سیاستدان جو تیرھویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوا اور پیرس کی یونیورسٹی کا پروفیسر رہا۔ اسکا فلسفہ پوپ کے اختیارات کم کرنا اور ریاست کی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا۔

مل، جون سٹوارٹ۔(Mill, John Stuart) ۱۸۰۶ء تا ۱۸۷۳ء۔ وہ ایک انگریز سیاسی معاشیات داں تھا۔

ناول۔ (Novellae Constitutiones Post Codicem
([Novels] ایک رومن قانونی مجموعہ۔

نطشے، فریڈرک۔(Nietzsche,Friedrich Wilhelm) ۱۸۴۴ء
۱۹۰۰ء۔ جرمن فلاسفر جس نے سپر مین کا تصور پیش کیا۔ اس نے مکمل انسان

کانظریہ بھی پیش کیا۔

ورجل۔(Virgil. Publius Vergilius Maro)

۷۰تا۱۹ق۔م۔ایک رومن شاعر۔

ہوٹ زما۔

ہیگل، جارج ولیہلم فریڈرک۔ (Hegel, George Wilhelm Friedrick) ۱۷۷۰ءتا۱۸۳۱ء جرمن فلسفی جو خالص اور قطعی تخیلاتی نظریہ کا حامی تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

میری رائے میں

ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم

کے مزار پر مندرجہ ذیل

رباعی بطور کتبے کے لکھنی چاہئے۔

"دلِ من رازدانِ جسم و جان است

نہ پنداری اجل بر من گران است

چہ غم گر یک جہاں گم شد زچشم

ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است"

مخلص محمد اقبال لاہور ۲ ستمبر ۱۹۲۰ء

[illegible]
[illegible] تعالی [illegible]
[illegible] بتاریخ [illegible] سنه [illegible]
[illegible]
[illegible] والسلام [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

گواه شد [illegible]
[illegible]
۱۲۰۱